عکسِ بانٹوا

حاجی موسیٰ لوائی

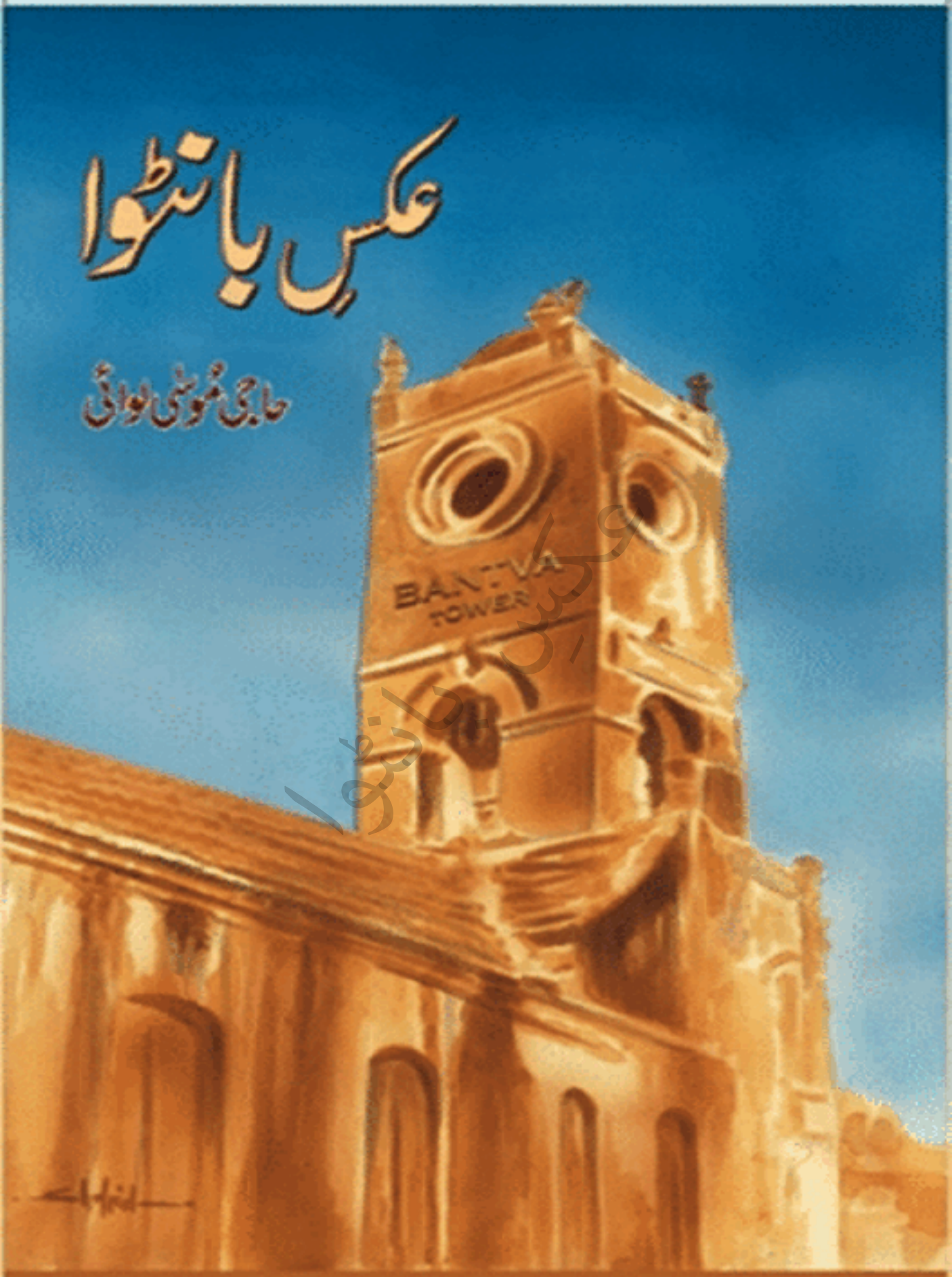

عکسِ بانٹوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

IN THE NAME OF ALLAH THE MOST BENEFICENT & MOST MERCIFUL

اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

THERE IS NO GOD BUT ALLAH: MUHAMMAD IS ALLAH'S MESSENGER

انتساب

شفیق والدہ محترمہ زینب حاجیانی

کے نام

اس یقین کے ساتھ کہ

والد محترم حاجی موسیٰ لوائی

بقید حیات ہوتے تو

یہ کتاب اپنی رفیقہ حیات کے

نام منسوب کرتے۔

قاسم موسیٰ لوائی

عکسِ بانٹوا

جملہ حقوق محفوظ ہیں

مصنف	حاجی موسیٰ لوائی
پرنٹ ایڈیشن	جنوری 2006
تعداد	ایک ہزار
ڈیجیٹل ایڈیشن	جون 2010
قیمت	US $ 10/-
گرافکس	فرزانہ قاسم
ٹیکنیکل ایڈوائزر	شعیب غازیانی
ناشر	قاسم موسیٰ لوائی

موسیٰ لوائی فاؤنڈیشن

Email: lawai49@yahoo.com

lawai49@gmail.com

Website: www.memonbooks.com

عکسِ بانٹوا

عکسِ بانٹوا

ڈیجیٹل ایڈیشن

پیش لفظ

عکسِ بانٹوا کا ڈیجیٹل ایڈیشن تیار کرنے کا خیال مجھے اپنے دورہ امریکہ میں اس وقت آیا جب میری ملاقات جناب عبدل غفار ورند صاحب سے اپریل 2010 میں شکاگو میں ہوئی ۔ جناب عبدل غفار صاحب عرصہ پندرہ سال سے شکاگو میں رہائش پذیر ہیں اور امریکہ میں میمن قوم کے فلاح و بہبود کے لیے ہمہ وقت سرگرم رہتے ہیں اور ایک ویب سائٹ www.memonpoint.com کے نام سے چلا رہے ہیں۔ ان سے میری جب بھی ملاقات ہوئی ان کا اصرار رہا کہ میں اپنے مرحوم والد جناب حاجی موسیٰ لوائی کی کتاب عکسِ بانٹوا کا ڈیجیٹل ایڈیشن تیار کروں۔ان کے بے حد اصرار پر میں نے کراچی میں اپنے دوست شعیب غازیانی سے فون پر بات کی اور ان سے کتاب کا ڈیجیٹل ایڈیشن تیار کرنے کے بارے میں مشورہ کیا۔شعیب بھائی نے مجھے اس کتاب کو کمپیوٹر کی زبان میں تبدیل کرنے میں بے حد مدد کی۔ وہ مسلسل دو ماہ تک روزانہ مجھے فون پر مشورہ دیتے رہے۔ اس طرح دو ماہ کی مسلسل محنت کے بعد اس کتاب کا ڈیجیٹل ایڈیشن کمپیوٹر میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔

عکسِ بانٹو کا ڈیجیٹل ایڈیشن تیار کرنے میں جناب شعیب غازیانی، جناب عبدل غفار ورند اور میری زوجہ محترمہ فرزانہ قاسم نے بہت تعاون کیا جس کے لیے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔اس کتاب کو آپ www.memonbooks.com اور www.memonpoint.com کی ویب سائٹ پر دیکھ سکتے ہیں۔

قاسم موسیٰ لوائی

جون 2010

پیش لفظ

بانٹوا، ریاست جونا گڑھ کا ایک اہم تعلقہ اور دربار تھا۔ ہرا بھرا، سرسبز و شاداب جہاں خوشحالی کا دور دورہ تھا، امن وسکون تھا، جونا گڑھ کے نواب مہابت خانجی کی خصوصی توجہ کی وجہ سے بانٹوا کو پورے کاٹھیاواڑ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ میمن برادری کی وجہ سے بانٹوا تجارت کا ایک بڑا مرکز بھی بن گیا تھا۔

بانٹوا میں میمنوں کی آبادی کی ابتدا 1755ء سے ہوئی بہت سے میمن خاندان دھوراجی سے بانٹوا آ کر آباد ہو گئے ان میں میرے جد امجد جناب احمد عبدالرحمٰن ڈنڈیا سرفہرست تھے یہاں میں اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے جد امجد پردادا جناب سومار عبدالرحمٰن ضلع کچھ کے گاؤں ونجھان سے ہجرت کر کے دھوراجی میں بس گئے تھے، اس سے قبل عبدالرحمٰن کے پردادا نور محمد ولد مانیک ڈنڈیا سندھ کے علاقے ہالا کے قریب ایک گاؤں ادھو مانیک سے ہجرت کر کے کچھ کے علاقے ونجھان میں رہائش پذیر ہوئے تھے اور اس طرح نہ صرف ہمارا خاندان بلکہ پوری میمن برادری کا تعلق صوبہ سندھ سے بنتا ہے۔ سندھ کے تاریخی مقام ٹھٹھہ سے بھی بڑی تعداد میں میمن ہجرت کر کے کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے۔ سولہویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں مانیک اور دیگر افراد جوہالا کے قریب و جوار میں آباد تھے، ایک مسلمان صوفی بزرگ جناب مولوی عبدالرزاق کے ہاتھوں شرف بہ اسلام ہوئے تھے دین اسلام کی اس عظیم دولت کو حاصل کرنے کے بعد غالباً ان پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا اور وہ اپنے دین کی حفاظت کی خاطر بانٹوا پہنچے تھے جہاں وہ تجارت کے اعتبار سے پورے ہندوستان کے بے تاج بادشاہ بن گئے تھے۔

میرے والد محترم حاجی موسیٰ لوائی نے ''عکس بانٹوا'' گجراتی زبان میں تحریر کی تھی اور اس کا ایک نسخہ عبدالعزیز کایا صاحب کو دیا تھا۔ عبدالعزیز کایا صاحب نے تاریخ بانٹوا کے نام سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی ہے جس میں نہ صرف بانٹوا میمن بلکہ دیگر میمن برادریوں کے حالات تفصیل سے رقم کیے ہیں، لہٰذا اس زمانے میں میرے والد محترم حاجی موسیٰ لوائی نے گجراتی زبان میں تحریر کردہ عکس بانٹوا کو عبدالعزیز کایا کے مشورے پر کتابی شکل میں لانا مناسب خیال نہ کیا اور یہ مسودہ سرد خانے میں چلا گیا۔ حاجی موسیٰ لوائی صاحب کا 20 اکتوبر 1997 کو انتقال ہوگیا جس کے کافی عرصے بعد ان کی کتاب کا مسودہ میرے ہاتھ آیا تو میں نے طے کرلیا کہ نئی نسل کو بانٹوا اور ہمارے بزرگوں کے بارے میں آگہی دینے کے لئے اسے اردو میں شائع کیا جائے اور آج الحمدللہ ''عکس بانٹوا'' خوبصورت کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اگر بزرگوں اور دوستوں کی حوصلہ افزائی شامل حال رہیں تو انشاءاللہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

عکس بانٹوا کو کتابی شکل دینے میں جناب عبدالشکور ابا عمر ڈاڈا جناب محمد صدیق پولانی جناب عبدالرزاق تھاپلہ والا عمر عبدالرحمان، کھتری عصمت علی پٹیل، ممتاز سینئر جرنلسٹ جناب اقبال پاریکھ، جناب احمد بتاشی اور جناب عبدالستار عمر نے بہت تعاون کیا جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

عکس بانٹوا کے مصنف حاجی موسیٰ لوائی نے نہ صرف بانٹوا میمن، بلکہ دیگر میمن برادریوں کی عمر بھر دل و جان سے بے لوث اور مخلصانہ خدمت کی۔ عکس بانٹوا میں انہوں نے اپنی اس تصنیف میں بانٹوا اور قریب و جوار کے علاقوں وہاں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے انہوں نے اس زمانے کی نامور شخصیات اور اداروں کی خدمات کا احاطہ بھی کیا ہے جس سے قارئین کو اس دور کے بارے میں اہم اور نادر معلومات حاصل ہوں گی مجھے امید ہے کہ جب قارئین خصوصاً نئی نسل کے افراد عکس بانٹوا کو پڑھیں گے تو ماضی کے حالات اور واقعات کے تناظر میں اپنے موجودہ اور مستقبل کے مسائل بہتر طور پر حل کرسکیں گے۔

قاسم موسیٰ لوائی

عکسِ بانٹوا

حاجی موسیٰ لوائی

ضروری وضاحت

عکس بانٹوا

میمن برادری کے ممتاز سماجی رہنما اور عکس بانٹوا کے مصنف جناب حاجی موسیٰ لوائی نے یہ کتاب تقریباً 85-1984ء میں لکھی تھی۔ مگر چند ناگزیر حالات کے سبب یہ کتاب اس وقت شائع نہ ہوسکی اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کتاب میں جتنے بھی واقعات و حالات اور اعداد و شمار درج ہیں وہ سب 1985ء سے پہلے تک کے ہیں۔ کتاب کے مصنف کا 20 اکتوبر 1997ء کو انتقال ہوگیا تھا۔

جناب حاجی موسیٰ لوائی کی بانٹوا میں میمن کمیونٹی کے لئے گراں قدر تعلیمی خدمات ہیں اور اس اعتبار سے عکس بانٹوا کی اہمیت و افادیت بڑھ گئی ہے اس کتاب کو نئی نسل کی رہنمائی کے لئے ملک بھر کے تمام کتب خانوں میں ہونا چاہئے۔

اقبال پاریکھ

عکسِ بانٹوا

حاجی موسیٰ لوائی

نمبر شمار	فہرست عنوان	صفحہ نمبر
1	ریاست جونا گڑھ اور بابی خاندان	11
2	درباروں کے اختیارات اور حقوق	13
3	بانٹوا کا محل وقوع	16
4	بانٹوا کی آبادکاری	18
5	ہمارے آباؤاجداد	19
6	بانٹوا کی طرز معاشرت	23
7	ریونیو کا جھگڑا اور ہڑتال	25
8	بانٹوا شاہراہ ترقی پر	28
9	میمن قوم کا جذبہ تعمیر و ترقی	32
10	بانٹوا شہر کی تعمیرات	33
11	مشترکہ خاندانی نظام	38
12	بانٹوا میں تعلیم و تربیت	39
13	بانٹوا کی جماعتی زندگی	42
14	بانٹوا کے تہوار	44
15	بانٹوا کے چند یادگار واقعات	48
16	بانٹوا میں قائداعظم کا قیام	50
17	بانٹوا انجمن کی خدمات	52
18	بانٹوا کے مذہبی معاملات	54

عکسِ بانٹوا

نمبر شمار	فہرست عنوان	صفحہ نمبر
19	پاکستان کے ساتھ الحاق اور سقوط جونا گڑھ	57
20	ویراول کی بندرگاہ	61
21	کراچی میں بانٹوا جماعت کا قیام	63
22	بانٹوا جماعت کی سماجی سرگرمیاں	68
23	کراچی میں میمنوں کی آبادی	74
24	بانٹوا انجمن حمایت اسلام	81
25	مولانا عبدالستار ایدھی	87
26	بانٹوا میمن خدمت کمیٹی	89
27	بانٹوا محمڈن لائبریری	93
28	اصلاح معاشرہ کی کاوشیں	94
29	کراچی میں بانٹوا میمن کمیونٹی کے دیگر ادارے	100
30	بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی (صفورا میمن گرلز بورڈنگ ھاؤس)	103
31	الجیلانی فاؤنڈیشن	110
32	بانٹوا کمیونٹی کی تعلیمی سرگرمیاں	112
33	میمنوں کی محلّہ وار جماعتیں	118
34	قومی اتحاد میں رکاوٹیں	120
35	چند گزارشات	123
36	گر تو برا نہ مانے	128
37	ملت کے نوجوانوں کی نذر	135
38	آج کا بانٹوا۔عبدالرزاق تھاپلہ والا	139
39	بانٹوا میمن برادری کی ذاتیں (Surname)	144
40	شجرہ بانٹوا بابی دربار (Genealogy)	148
41	شجرہ حاجی موسیٰ لوائی (Family Tree)	150
42	تصاویر (Photographs Section)	151
43	کتاب کے مصنف کے بارے میں (About the Author)	176

عکسِ بانٹوا

ریاست جوناگڑھ اور بابی خاندان

برصغیر میں مغل شہنشاہوں کی اپنی شان بان تھی۔صدیوں سے حکمرانی کرنے والے یہ مغل فرمانروا ہزاروں میل پر مشتمل اپنی عظیم الشان سلطنت کو صوبے داروں کے ذریعے کنٹرول کرتے تھے،مغلوں کی یہ دیرینہ روایت تھی کہ وہ اپنے وفاداروں اور جانثاروں کا بے حد خیال کرتے تھے،ان کی وفاداری کی آنے والی کئی نسلوں کو عیش و آرام نصیب ہو جاتا تھا۔

زمانہ قدیم میں جوناگڑھ بھی مغل شہنشاہوں کی سلطنت میں شامل تھا۔ایک مغل فرمانروا نے اپنے کسی صوبے دار کو انعام واکرام کے طور پر 48 تعلقوں کی ایک جاگیر عطا کی تھی جس میں بٹگام،اقلیر،پاجود اور کاتھک بھی شامل تھے ان تعلقوں میں ایک تعلقہ بانٹوا کے نام سے بھی تھا۔ایک طویل عرصے تک ان تعلقوں پر جوناگڑھ کے بابی خاندان کے نوابوں کی بالادستی رہی اور بابی نواب بانٹوا کو اپنا دربار بنا کر اس پر حکمرانی کرتے رہے۔

درویش صفت،متقی اور پرہیز گار مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت پر زوال آ گیا اور شاہی خاندان میں باہمی خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں تھیں اس وجہ سے دور دراز علاقوں کی خبر گیری نہ کر سکے اور پورے ہندوستان میں ایک افراتفری سی پھیل گئی اور ہر طرف بغاوتیں ہونے لگیں ان بغاوتوں کو کچلنے کے لئے کوئی طاقتور مغل شہنشاہ موجود نہیں تھا جس کے باعث مغلیہ سلطنت کا شیرازہ انتہائی تیزی سے بکھرنے لگا اور اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان کے بیشتر صوبے داروں نے اپنے اپنے زیر تسلط علاقوں میں خودمختاری کا اعلان کر دیا۔

بانٹوا کے تعلقہ داروں کے بڑے بھائی بابی شیر خان بھی پیچھے نہ رہے،انہوں نے بھی ریاست جوناگڑھ کی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور اپنی آزاد حکومت کا جھنڈا بلند کیا۔خود مختیاری کے اعلان کے بعد بابی خاندان کی ریاست جوناگڑھ پر گرفت مزید مضبوط ہو گئی۔اس طرح ملک سورٹھ میں خاندان مغلیہ کی ڈیڑھ سو سالہ حکومت کے بعد بابی خاندان کی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

بابی نواب 48 تعلقوں پر مشترکہ طور پر حکمرانی کرتے رہے ان بابی فرمانرواؤں میں کچھ کی اولاد کم تھی اور کچھ کی زیادہ لیکن وہ آپس میں تقسیم در تقسیم حکومت کرتے رہتے تھے۔

ہندوستان پر انگریزوں نے اپنا قبضۂ اقتدار قائم کرنے کے بعد 90-1880ء میں راجکوٹ میں اپنی ایجنسی قائم کی۔ ان دنوں بانٹوا کی ملکیت کے سلسلے میں نواب بھائیوں کے درمیان تنازعہ پیدا ہوا اور اس کے باعث 1900ء میں ان کے درمیان جنگ ہوئی۔ انگریز حکمرانوں تک بات پہنچی تو حکومت برطانیہ کے پولیٹکل ایجنٹ نے بابی برادران کے اس تنازعہ میں ثالثی کر کے ان کے درمیان سمجھوتا کرادیا۔

اس سمجھوتے کے مطابق بانٹوا تعلقہ تین بھائیوں کی ملکیت قرار پایا جس میں ماناوَدر کا حصہ 50 فیصد رکھا گیا جبکہ سردارگڑھ کا حصہ 25 فیصد اور بانٹوا کا بھی 25 فی صد رکھا گیا۔

اس طرح ماناوَدر، سردارگڑھ اور بانٹوا الگ الگ ہوجانے کی وجہ سے 48 تعلقے تین حصوں میں تقسیم ہوگئے اس میں ریاست ماناوَدر کو 24 گاؤں جبکہ سردارگڑھ اور بانٹوا کے حصے میں بارہ بارہ گاؤں (تعلقے) آئے۔ اس تقسیم کے مطابق تالاب کی زمین بانٹوا مجموع دربار کی، تالاب سے منسلک کھراواڑ اور دھڑ اشیر کی زمین ماناوَدر کی اور سڑک کے سامنے کی زمین سردارگڑھ کی شماری ہوئی۔ دھڑ اشیر کی زمین بعد میں 'اسلم پورہ' کے نام سے مشہور ہوئی۔

لیکن بعد میں ماناوَدر نے کھراواڑ اور اسلم پورہ کی زمین اور سردارگڑھ نے سڑک کے سامنے کی زمین فروخت کردی تھی۔ اس زمانے میں ان علاقوں کے نواب اور حکمران 'دربار' کہلاتے تھے۔

جب بانٹوا تعلقہ تین بھائیوں کی مشترکہ ملکیت قرار پایا اور تعلقوں کی حصوں کے مطابق تقسیم ہوئی تو ان نوابوں کی مشترکہ ملکیت کے سبب ان کے مجموعی اقتدار کو 'مجموع دربار' کہا جانے لگا اور بانٹوا کو اسی لحاظ سے بانٹوا مجموع کہا گیا۔ یعنی درباروں کی مجموعی یا مشترکہ ملکیت۔

انگریزوں نے راجکوٹ میں جو پولیٹکل ایجنٹ مقرر کیا تھا، وہ ان ریاستوں کے معاملات کا ذمہ دار اور نگران تھا۔ ان علاقوں کے دربار براہ راست برطانوی پولیٹکل ایجنٹ کو جواب دہ تھے جبکہ اپنے اپنے علاقوں میں دربار خودمختار تھے جنہیں برطانوی سرکار سے مخصوص حقوق حاصل تھے۔

درباروں کے اختیارات اور حقوق

بانٹوا مجموع دربار کا ریونیو آفس بانٹوا کے دروازے کے اندر کی جانب قائم تھا جسے 'بانٹوا مجموع تحصیل داری' کہا جاتا تھا۔ مجموع درباروں کے دیوان (نائب) ہر ماہ اس تحصیل آفس آتے اور تمام امور طے کرتے۔ تحصیل داران کے سامنے ایک ایک درخواست پیش کرتے اور یہ دیوان ہر ایک پر فیصلہ صادر کرتے تھے۔

بانٹوا مجموع کے درباروں کو بانٹوا سے محصول یا زرخراج لینے کے حقوق حاصل تھے۔ بانٹوا میں کوئی ملکیت (جائداد) فروخت ہوتی تو درباروں کو فصلی دعویٰ (لاگا ٹکا) لینے کا حق تھا جو ایک طرح سے ٹیکس تھا۔ رواج تھا کہ مانڈوی (مونگ پھلی) کا اجارہ وغیرہ دینے کا بھی انہیں اختیار حاصل تھا جبکہ نیا مکان تعمیر کرنے کے لئے مجموع دربار کی اجازت حاصل کرنا بھی لازمی تھا۔

یوں تو بانٹوا کے پاس اس کی اپنی شہری بلدیہ (میونسپلٹی) بھی تھی۔ میونسپلٹی کے پاس مکان کی تعمیر کی اجازت دینے کے اختیارات نہ تھے بلکہ میونسپلٹی صرف اسی حکم پر عمل کرتی تھی جو دیوان صاحب جاری کرتے۔ شہر میں سڑک وغیرہ تعمیر کرنے کے لئے بھی میونسپلٹی کو مجموع درباروں سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ شہر میں دیا بتی (روشنی کا انتظام) اور گلی محلوں کی صفائی وغیرہ کے کام میونسپلٹی ہی کرتی تھی۔

بانٹوا میں مجموع درباروں کی اپنی بھی عدالت تھی۔ البتہ ان مجموع درباروں کے پاس وزارت انصاف کے حقوق (جوڈیشل رائٹس) نہیں تھے اور نہ ہی انہیں شعبۂ پولیس کے حقوق حاصل تھے۔ یہ کام راجکوٹ کی انتظامیہ کرتی تھی۔ بانٹوا کے منصف پانچ ہزار روپے سے کم رقم کے مقدمات سماعت کے لئے قبول کر سکتے تھے۔ لیکن پانچ ہزار روپے سے زائد کے مقدمات راجکوٹ کے سول جج کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ سول جج کے فیصلے کے خلاف برطانوی سیشن اور برطانیہ کی ہائی کورٹ میں اپیلیں کی جا سکتی تھیں۔

اسی طرح برطانیہ کی ہائی کورٹ جو کہ راجکوٹ کے صدر کے علاقے میں تھی، کے خلاف بانٹوا مجموع کی اپیل دہلی اور لندن کی سپریم کورٹ تک جا سکتی تھی۔

یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ بانٹوا مجموع کی رعایا کو برطانوی باشندوں کے مساوی قانونی حقوق حاصل تھے۔بانٹوا کے جوڈیشل رائٹس میں بانٹوا کے علاوہ پاجود، بھلگام اور اکلیسر بھی شامل تھے۔لیکن ماناوَدر چوتھے درجے کی ریاست شمار ہوتی تھی اور اس کے 24 تعلقوں کے عدل وانصاف کا حق ماناوَدر کو ہی تھا۔جبکہ سردارگڑھ چھٹے درجے کی ریاست تھی اور اس کے 12 گاؤں کے جوڈیشل حقوق سردارگڑھ کے پاس ہی تھے۔لیکن سردارگڑھ کے بھی پانچ ہزار روپے سے زائد رقم کے مقدمات راجکوٹ کے سیشن جج کی عدالت میں ہی پیش ہوتے تھے۔البتہ چھوٹے چھوٹے گاؤں پر مشتمل ہونے کے سبب سردارگڑھ سے شاذونادر ہی کوئی کیس راجکوٹ کی سیشن کورٹ میں پیش ہوتا تھا۔

بانٹوا کی طرح ماناوَدر کو بھی جوڈیشل رائٹس حاصل نہ تھے۔ان کے مقدمات اور اپیلیں برطانیہ کی عدالتوں میں لندن سپریم کورٹ تک جاتی تھیں۔یہی پوزیشن سردارگڑھ کی تھی۔سردارگڑھ میں دو بھائی تھے جو خان بھلا کہلاتے تھے اور ان کے پانچ گاؤں کو خان بھلا دربار صاحب کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔خان بھلا دربار کو ٹیکس حاصل کرنے کے حقوق تو حاصل تھے۔لیکن اس کے محکمہ انصاف کے اختیارات یعنی جوڈیشل رائٹس سردارگڑھ کے پاس تھے جس کے انصاف کے اختیارات بانٹوا مجموع دربار جیسے ہی تھے۔

ماناوَدر تعلقہ کے دربار بچو میاں تھے جو بعد میں بابی صاحب کے نام سے آخر تک دربار رہے۔سردارگڑھ کے دربار اور ان کے فرزند بھی آخر تک حکمران رہے۔لیکن سردارگڑھ کے دربار صاحب کو ایک مقدمہ میں ملوث ہوجانے کی وجہ سے راجکوٹ کے پولیٹکل ایجنٹ نے اقتدار سے الگ کر کے اختیارات ان کے منیجر کے سپرد کر دیئے تھے۔کیونکہ اس وقت سردارگڑھ کے دربار کے فرزند نابالغ تھے۔بعد میں جب ان کے فرزند لندن سے تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تو اقتدار انہیں سونپ دیا گیا۔اس وقت سردارگڑھ کے سابق دربار کو کاٹھیاواڑ میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔البتہ 1945ء میں وہ ایک مرتبہ آئے تھے اور راجکوٹ میں ہی مقیم رہے تھے۔

بانٹوا کے بارے میں ذکر ہو رہا تھا۔اس تعلقہ کے بارہ گاؤں کے 32 حصہ دار تھے جو سب کے سب بھایات (رشتہ دار) تھے لیکن چونکہ بانٹوا کے عدل وانصاف کے اختیارات بانٹوا تعلقہ کے پاس ہی تھے اس لئے ان 32 حصہ داروں میں سے ہی کسی ایک کو دربار منتخب کیا جاتا تھا۔البتہ گاؤں کی زمینیں یہ برادران آپس میں تقسیم کر لیتے

تھے اور اس کی تمام آمدنی (محاصل) اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔شیر ولید خانجی 60 سال تک بانٹوا تعلقہ کے دربار رہے۔بعد میں ان کے فرزند شیر خانجی برسر اقتدار آئے جو آخری وقت تک بانٹوا کے دربار رہے۔

بانٹوا مجموع دربار کو یا بانٹوا کے عوام کو کسی شخص پر کوئی مقدمہ دائر کرنا ہوتا تو وہ بانٹوا مجموع کی عدالت میں مقدمہ دائر کر سکتا تھا۔لیکن اگر مقدمہ بڑا ہوتا تو اسے بھی راجکوٹ کی سول کورٹ کے دروازے پر دستک دینا پڑتی تھی۔

1944ء میں حکومت برطانیہ نے قانونی ڈھانچے میں تبدیلیاں کیں جن کی رو سے برطانیہ کی عدالتوں اور برطانوی پولیس کو جو جوڈیشل حقوق حاصل تھے وہ تمام حقوق حکومت برطانیہ نے ریاست جوناگڑھ کو منتقل کر دیئے۔ چنانچہ پانچ ہزار روپے سے زائد رقم کے مقدمات اور جائداد کی رجسٹریشن جو پہلے راجکوٹ میں ہی ہو سکتی تھی اب ریاست جوناگڑھ میں ہونے لگی اور تقسیم ہند یعنی 1947ء تک یہ معمولات جاری رہے۔

☜ ☜ ☜

عکسِ بانٹوا

بانٹوا کا محلِ وقوع

بانٹوا جس علاقے میں واقع ہے وہ جزیرہ نما ہے جس کے شمال میں خلیج کچھ، جنوب میں خلیج کھمبت اور مغرب میں بحیرہ عرب ہے۔ اس جزیرہ نما کو زمانہ قدیم میں سوراشٹرا کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس علاقے کا نام کاٹھیاواڑ مشہور ہوا۔ کاٹھیاواڑ کا ایک حصہ 'سورٹھ' کہلاتا تھا۔ اس سورٹھ کے علاقے کے وسط میں بانٹوا واقع ہے۔

بانٹوا خط استوا سے 21-28 درجے عرض بلد اور 7-70 درجے طول بلد پر واقع ہے۔ یہ ماناوَدر سے صرف سات کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جبکہ جوناگڑھ اور بانٹوا کے درمیان 44 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ بانٹوا کا رقبہ 30-39 مربع کلومیٹر ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ ضلع جوناگڑھ کے وسط میں واقع ہے۔ مغرب کی جانب سے بانٹوا شہر سمندر سے 12 میل کے فاصلے پر آباد ہے اور سطح سمندر سے 34 فٹ بلند ہے۔

بانٹوا میں بارش کی اوسط تقریباً چالیس انچ تھی۔ زیادہ بارشوں کے سبب اس کے اردگرد کے علاقے کے دریا اور ندیاں اکثر بھر جاتی تھیں اور ان کا پانی بانٹوا شہر کی طرف بہنے لگتا تھا کیونکہ اس کے اردگرد کا علاقہ زیادہ تر نشیبی تھا۔ یہاں گرمی کے موسم میں سخت گرمی پڑتی تھی۔ درجہ حرارت زیادہ سے زیادہ 40 ڈگری سینٹی گریڈ اور کم سے کم 10 ڈگری سینٹی گریڈ رہتا تھا۔ مئی جون میں گرم ہواؤں کے تیز جھکڑ چلتے تھے اور سردیوں میں شدید سردی پڑتی تھی۔ بہرحال نزدیک میں سمندر واقع ہونے کے سبب یہاں کا موسم عام طور پر خوشگوار رہتا تھا۔

محلِ وقوع کے لحاظ سے بانٹوا کے مغرب میں خاص خاص گاؤں اکلیسر، بھلگام، کوڈواؤ، کتیانہ۔ شمال میں سردارگڑھ، بوری، دادوا، بھنڈورا۔ مشرق میں خان بھلا (سلطان آباد) وتھلی، ناکرہ، گام ٹکر۔ شمال مشرق میں بالاگام، خامبھلیہ۔ جنوب میں کیشود۔ تھاپلہ، مانگرول وغیرہ تھے۔

ان کے علاوہ بھی بانٹوا کے اردگرد مختلف ناموں کے کئی دیہات تھے۔ قدیم زمانے میں بانٹوا کے گردونواح سے بے شمار لوگ بانٹوا آئے اور یہ جگہ انہیں اس قدر بھائی کہ وہ مستقل طور پر بانٹوا میں رہنے لگے۔ باہر سے آنے

والوں میں سب سے آگے میمن تھے جو سب سے پہلے بانٹوا آئے اور بانٹوا کے تعلق سے ہی پہچانے جانے لگے۔بعد میں انہوں نے بانٹوا کے نام کو اپنے خاندانی لقب کے ساتھ جوڑ دیا۔

☛ ☛ ☛

عکسِ بانٹوا

بانٹوا کی آبادکاری

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ بانٹوا کب وجود میں آیا اور کس کس عہد سے گزرا؟ اس کے متعلق کم ازکم میرے پاس کوئی قابل تائید وتقویت معلومات نہیں ہیں۔ کیونکہ میں کوئی مصنف یا تاریخ داں بھی نہیں کہ اس سلسلے میں تحقیق کر کے کوئی حتمی نتیجہ اخذ کرسکوں۔ البتہ یہ درست ہے کہ شروع میں بانٹوا میں سیّدوں کی آبادی تھی۔ بانٹوا اور بھلگام میں ان کی زمینیں اور املاک تھیں۔ ان کی کچھ املاک تو بانٹوا کے درباروں نے لے لی تھیں اور باقی املاک میمن سیٹھوں نے خرید لی تھیں۔

ماناوَدر کی طرف جانے والی سڑک پر جو قبرستان تھا اس کی زمین اور بانٹوا کے مدرسۂ اسلامیہ اور بانٹوا یتیم خانہ کی زمین بھی اصل میں تو سیّدوں کی ہی تھی لیکن میمنوں نے چند زمینیں سیّدوں سے اور بعض زمینیں درباروں سے خرید لی تھیں۔ یتیم خانہ اور مدرسہ اسلامیہ کی زمینوں کی قیمت حاجی غنی برادرز نے ادا کی تھی۔ یتیم خانہ کی عمارت میرے دادا قاسم لوائی کے ہاتھوں تعمیر ہوئی جبکہ مدرسۂ اسلامیہ کی عمارت کی تعمیر میں دوسرے لوگوں نے بھی تعاون کیا تھا۔

میرے دادا قاسم لوائی ایک عمدہ راج (معمار) تھے۔ لیکن انہوں نے 1892ء میں راج گری یعنی عمارت تعمیر کرنے کا کام چھوڑ کر لکڑی کے کھڑکی دروازوں وغیرہ کا کام شروع کر دیا۔ بانٹوا میں رانی شریف کی مسجد کے سامنے جرنی پوسٹ آفس کے بالمقابل انہوں نے لکڑی کا بہت بڑا کودام بھی بنایا تھا۔

حاجی اے رحمن خاپ والا ملا تھے۔ انہوں نے دھنا شیر کے سامنے ویل تلاوَڈی جانے والی سڑک پر کافی بڑا مکان بنایا تھا۔ بمبئی میں ان کی کپڑے کی دکانیں تھیں۔ وہ بالکل میمنوں کی طرح لگتے تھے اور بے حد نیک و پرہیز گار انسان تھے۔

ہمارے آباؤاجداد

بانٹوا میں مختلف اٹک یعنی خاندانی نام مختلف کرداروں کے باعث وجود میں آئے۔ پردیس میں تجارت کرنے والے میمن جس مقام پر تجارت کرتے اس مقام کے کردار سے بھی ان کا خاندانی نام یا لقب پڑ جاتا۔ جیسے کہ پاجودوالے، سنوسروالے، کلکتہ والے وغیرہ۔

دھوراجی کے میمن سیّدوں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ انہیں پیر مانتے اور ان کا ادب واحترام برقرار رکھتے تھے۔ اسی لئے دھوراجی کے میمنوں اور سیّدوں کے مابین گہرا رابطہ رہتا تھا۔ بانٹوا میں دھوراجی سے سب سے پہلے ڈنڈیا اور ایدھی فیملی کے افراد آئے۔ انہیں سیّدوں نے خصوصی دعوت دے کر بلایا تھا۔ سیّدوں اور درباروں نے ان کا بے حد عزت واحترام سے استقبال کیا اور انہیں کچھ زمینیں عنایت کی تھیں۔

1910-15ء میں گونڈل کے مہاراجہ نے ڈنڈیا فیملی کو بانٹوا خط ارسال کیا اور ان کی جائداد اور املاک پر غیر ادا شدہ لگان محصول فوراً ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ خط میں یہ انتباہ بھی کیا گیا کہ انکار کی صورت میں سرکار املاک قرق کرلے گی۔ ہمارے فیملی بھی ڈنڈیا فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔

حسین قاسم دادا نے جو شجرہ نسب جاری کیا اس میں عمر سے آگے ہمارا خاندان ہے یعنی میں موسیٰ ولی محمد۔ قاسم۔ موسیٰ عمر۔ سومار۔ احمد۔ عبدالرحمٰن۔ سومار۔ ولی محمد۔ نور محمد اور مانیک اس وقت ہمارا خاندانی نام ڈنڈیا تھا۔ لیکن بعد میں ہمارا خاندانی نام میرے دادا قاسم کی وجہ سے لوائی ہوگیا۔ اس کی وجہ ایک دلچسپ حقیقت ہے۔ ہمارے دادا قاسم بہت خوبصورت تھے۔ ان کی شکل وصورت لوائیڈ (بتاشا) جیسی تھی اس لئے دوست احباب انہیں لوائیڈ کے لاڈلے کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ اس طرح ہمارا خاندانی نام ہی لوائی ہوگیا۔

اٹک (خاندانی نام) دوسری وجوہ کے باعث بھی ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر ہمارے دادا کے بھائی غنی اور ابراہیم بالکل بھولے بھالے اور درویش صفت تھے۔ اس طرح ان کی اولاد بطور 'درویش' شناخت ہوئی۔ اسی طرح مختلف پیشہ وتجارت کے حساب سے بھی خاندانی نام وجود میں آئے۔

یہاں پر یہ بات بتاتا چلوں کہ ہمارے بزرگ پر داداؤں کے دادا احمد دھوراجی سے بانٹوا آئے تھے جب کہ احمد کے دادا سومار ضلع کچھ کے گاؤں وِنجھان سے دھوراجی ہجرت کر کے گئے تھے۔

اسی طرح سومار کے دادا نور محمد سندھ کے شہر ہالہ کے قرب و جوار کے اپنے آبائی گاؤں ادھو مانیک سے ہجرت کر کے کچھ کے گاؤں وِنجھان رہنے کے لئے چلے گئے تھے۔جبکہ ہمارے بزرگ مانیک اور خاندان کے دیگر افراد جن کا تعلق سونپاس ڈنڈیا لوہانہ ذات سے تھا اس وقت اپنا ہندو مذہب چھوڑ کر 1581ء میں مولوی عبدالرزاق کے ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔

یہ تھی ہمارے بزرگوں کے طویل سفر کی مختصر داستان جس پر آج بھی ہم کو رشک ہے۔

جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں درباروں اور سیّدوں نے بانٹوا آنے والے میمنوں کو قابل کاشت زمینیں عنایت کی تھیں میمن لوگ محنتی اور جفاکش تھے۔چنانچہ ان زمینوں میں زراعت وکھیتی باڑی کا کام میمن خود ہی کرتے تھے اور دوسرے پیشوں میں بھی سرگرم عمل رہتے تھے۔کاشت وزراعت (کھیتی باڑی) میں مصروف ومشغول رہنے والے یہ میمن ایک نامور تاجر قوم کس طرح بن گئے؟اس کا پس منظر مجھے جناب سلیمان بھورا مرحوم نے بتایا تھا۔

بقول جناب سلیمان بھورا مرحوم، دوسو یا اڑھائی سو سال پہلے ایران سے ہجرت کر کے گجرات آنے والی ایک قوم نے یہاں سکونت اختیار کی تھی۔یہ قوم پارسی کہلاتی تھی۔اس زمانے میں سورت (سورتھ) کی بندرگاہ تجارت کا مرکز تھی۔عرب بھی اس بندرگاہ سے تجارت کیا کرتے تھے۔پارسی قوم تجارت میں ماہر تھی۔رفتہ رفتہ پارسی تجارت میں ترقی کرتے رہے اور بمبئی کے بعد سارے ہندوستان پر چھا گئے۔

میمن سندھ سے ہجرت کر کے اس علاقے میں آئے تھے۔جو میمن سورت میں مقیم ہوئے وہ سورتی میمن کہلائے۔کچھ (Kutchh) میں قیام کرنے والے کچھی میمن کہلائے جبکہ ہالار اور کاٹھیاواڑ میں جو میمن آباد ہوئے انہیں ہالائی میمن کہا جاتا تھا۔

بقول جناب سلیمان بھورا، پارسیوں کے ساتھ ملازمت میں سب سے پہلے سورتی میمن منسلک ہوئے۔ سورتی میمنوں نے اپنی محنت، ہنرمندی اور ماہرانہ معاشرتی سرگرمیوں کے سبب ملازمت میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔

پھر رفتہ رفتہ وہ اپنا ذاتی کاروبار اور تجارت قائم کر کے اس کی نشوونما کرتے رہے۔شروع میں ہونے والی کامیابیوں کے سبب ان کی مہم جوئی کی صلاحیتیں کھلتی گئیں اور وہ سیلون، برما اور افریقہ تک پیش قدمی کر گئے۔

سورتی میمنوں نے برما میں پارسی فرموں کے شیئرز (حصص) خریدے جس میں انہیں کثیر آمدنی ہوئی۔ کیونکہ دس بیس روپے میں خریدے گئے ان حصص کا ڈیویڈنڈ بڑھ کر سو روپے تک جا پہنچا تھا اس لئے ان کی خود اعتمادی میں بے حد اضافہ ہوا اور ان کا سرمایہ بڑھتا ہی چلا گیا۔مگر ان لوگوں نے تجارت سے کمایا ہوا پیسہ اپنی ذات پر ہی نہیں بلکہ عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں پر بھی خرچ کیا۔انہوں نے مساجد تعمیر کرائیں اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے کئی دوسری عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔رنگون میں سورتی بازار ان سورتی میمنوں کی وجہ سے ہی مشہور و معروف تھا۔

پھر ان سورتی میمن سیٹھوں کے ساتھ کچھی میمن بھی ملازمت میں شریک ہوئے اور بعد میں یہ لوگ بھی اپنی الگ تجارتی فرمیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔انہوں نے بھی تیزی سے ترقی کی اور سارے ہندوستان میں اپنا تجارتی حلقہ قائم کر لیا۔

بعد میں یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا۔کچھی میمنوں کے ساتھ ہالائی میمنوں نے بھی ملازمتیں شروع کیں اور انہوں نے بھی ترقی کی اسی منزل کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔اس پیش رفت کے سبب وہ ہندوستان کے علاوہ چین، افریقہ، برما، سیلون، یورپ، جاپان اور سنگاپور وغیرہ میں بھی اپنے تجارتی دفاتر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

تجارت میں ترقی کے ساتھ ساتھ میمنوں کی دولت میں اضافہ ہوتا رہا۔لیکن بعد میں مقدر نے نیا موڑ لیا۔ کچھی اور سورتی میمنوں نے تجارت میں حاصل ہونے والی وافر دولت سے جائیدادیں خریدنا شروع کر دیں۔ جائدادوں کی خریداری پر پیسہ خرچ کرنے کے علاوہ انہوں نے تعمیرات پر بھی دل کھول کر خرچ کیا۔مساجد اور عوامی فلاح و بہبود کے مقامات تعمیر کرانے میں تو جیسے ان دونوں قوموں میں مقابلہ ہو رہا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں اپنی انفرادی املاک کو آباد کرنے کا رجحان بھی پروان چڑھتا رہا۔ان کی جائدادوں کے کرائے کی صورت میں انہیں اتنی کثیر اور وافر آمدنی ہونے لگی کہ ان کی نسلوں کو تجارت و بیوپار میں دلچسپی لینے کی ضرورت ہی نہ رہی۔چنانچہ کچھی اور سورتی میمنوں کی نسلیں کرائے کی آمدنی پر ہی تکیہ کرتے ہوئے بود و باش

کرتی رہیں اور تقویت کے طور پر چھوٹی بڑی ملازمتیں بھی کرتی رہیں۔

رفتہ رفتہ یہ لوگ شعبۂ تجارت میں برائے نام ہی رہ گئے۔ کچھی میمنوں کی سخاوتوں کی عظیم الشان یادگاریں آج بھی پاک و ہند کے علاوہ برما اور افریقہ میں بھی نظر آتی ہیں۔ کچھ میں بھی میمنوں نے مساجد کے علاوہ اسکول اور دینی مدارس قائم کئے۔ بمبئی میں حجاج کرام کے لئے حج مسافر خانہ، متعدد اسکول و کالج اور دواخانے ان کی سخاوتوں کی قصیدہ خوانی کرتے نظر آتے ہیں۔

ہالائی میمنوں کا انداز کچھی اور سورتی میمنوں سے قدرے مختلف تھا۔ بیوپار اور تجارت کے ہر جگہ موجود رہنے والے سامراجوں کے حامل ہالائی میمنوں کی اس پیشے میں ابتدا بھی بڑی کمزور تھی۔ سب سے پہلے تو انہوں نے ملازمتوں کے ذریعے ہی تجربہ حاصل کیا تھا۔ مثال کے طور پر بانٹوا کی پرانی فرمیں پیر محمد دیوان، حاجی ایوب، پیر محمد اسحاق وغیرہ کے سیٹھوں نے عملی زندگی کی ابتدا ملازمت سے ہی کی تھی۔ اسی طرح دھوراجی، کتیانہ، جیت پور، اپلیٹا اور کونڈل وغیرہ کے میمن بھی ہندوستان سے سیلون، برما اور عدن تک پھیل گئے تھے۔

عکسِ بانٹوا

بانٹوا کی طرز معاشرت

بانٹوا میں بانٹوا میمن جماعت کی حیثیت پنچائت جیسی تھی۔ کسی میمن کو کسی سے اختلاف پیدا ہوجاتا تو پنچائت اس معاملے کا فیصلہ کردیتی۔ 1901ء میں اس کا باقاعدہ نام 'بانٹوا میمن جماعت' رکھا گیا اور ایک جماعت خانہ بھی قائم کیا گیا۔ اس جماعت خانہ کے لئے ایک روپیہ مربع فٹ کے حساب سے زمین خریدی گئی تھی۔ جماعت خانے کا کمپاؤنڈ (چاردیواری) میرے دادا جان قاسم لوائی کی نگرانی میں کالے سیاہ پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ جماعت خانے کے سربراہوں میں اس وقت میرے دادا قاسم لوائی کے علاوہ حاجی ایوب غنی، پیر محمد دیوان، صالح محمد ڈھریا اور ان کے بھائی اور حاجی علی محمد بھرمچاری شامل تھے۔

لیکن اس وقت بانٹوا میمن جماعت کا کوئی آئین ومنشور نہ تھا۔ چنانچہ فیصلے صرف پنچائت ہی کرتی تھی۔ 1920ء میں پنچائت میں کئی ترامیم کی گئیں۔ اس وقت پنچائت کے ممبران کے انتخاب کا کوئی طریقہ کار موجود نہ تھا۔ بس سال دو سال بعد ایک میٹنگ منعقد کرکے پنچائت کے اراکین کے ناموں کا اعلان کردیا جاتا تھا۔ 32-1930ء میں پنچائت کے لئے چند قواعد وضوابط وضع کئے گئے۔ پرانے صاحبان پنچائت اللہ عزوجل کو پیارے ہوگئے تھے۔ عام طور پر حسین قاسم صدر اور آدم پیر محمد نائب صدر رہتے تھے۔

بانٹوا میں نکاح کی پرچی دینے کا آغاز بھی 15-1910ء سے ہوا تھا۔ کاپڑیا احمد لدھا نام کے ایک صاحب نکاح کی پرچی دیا کرتے تھے۔ 1930ء کی ترامیم کے بعد 1947ء کی ہجرت تک میرے چچا حاجی عمر ولد حاجی قاسم لوائی اعزازی سیکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔

بانٹوا جماعت عملی طور پر بانٹوا میں مقیم تمام لوگوں کی نمائندہ جماعت تھی۔ 85 سے 90 فیصد میمنوں کی آبادی کے حامل بانٹوا میں ہندو قوم کے دھوبی، نائی (حجام) اور موچی وغیرہ بھی اقتصادی طور پر میمنوں پر ہی انحصار رکھتے تھے اور ان کی معاش کا دارومدار میمنوں پر ہی تھا۔

بانٹوا کی یادگار ہڑتال کے بعد تو بانٹوا جماعت کی اتنی دھاک بیٹھ گئی کہ انگریز حکومت کے پولیٹکل ایجنٹ بھی ہر سال بانٹوا جماعت سے دریافت کرتے کہ کوئی تکلیف، دشواری تو نہیں ہے؟ اور اگر کوئی تکلیف، دشواری ہوتی تو وہ فوراً اس کا ازالہ کر دیتے۔ یہاں تک کہ حکومت کے افسران کے تبادلے بھی جماعت کے کہنے پر کرائے جاتے تھے۔ اس طرح بانٹوا جماعت ایک طرح سے اقتدار و اختیار کی مالک بن گئی تھی۔

☛ ☛ ☛

عکسِ بانٹوا

ریونیو کا جھگڑا اور ہڑتال

بانٹوا کی جیل پیرون دروازہ تھی۔تقریباً 1920ء میں بانٹوا مجموع درباروں نے یہ جیل قاسم دادا کو فروخت کردی تھی۔اس کی فروخت کے خلاف اس وقت کے سیٹھ صالح محمد ڈدھریا نے دہلی تک قانونی جنگ لڑی۔ لیکن اس مقدمے کے فیصلے میں یہی قرار پایا کہ سارے کے سارے ریونیو رائٹس سب درباروں کے پاس ہونے کے سبب وہ اپنی مرضی کے مطابق جیل فروخت کرسکتے ہیں۔ایک غیر تصدیق شدہ اور مشتبہ خبر کے مطابق سیٹھ صالح محمد ڈدھریا اس جیل کی فروخت کے معاملے کو لندن کی سپریم کورٹ تک لے گئے تھے،لیکن اپیل سماعت کرنے کے قابل نہ تھی اس لئے اسے خارج کردیا گیا۔

بانٹوا درباروں کے خلاف بانٹوا کے ایک شہری سیٹھ صالح محمد ڈدھریا کا کیس تھا۔اس سے پہلے تقریباً 1910ء میں بھی بانٹوا کی رعیت اور دربار صاحب میں ایک تنازعہ پیدا ہوا تھا۔ہوا یوں کہ ماناوَدر کے دربار صاحب نے بانٹوا کے شہریوں پر 32 نئے لگان ومحاصل نافذ کرنے کی درخواست بانٹوا مجموع دربار صاحب کی کمیٹی میں پیش کی۔(یہ پہلے بھی وضاحت کرچکا ہوں کہ بانٹوا،ماناوَدر،سردارگڑھ وغیرہ کے درباروں کی ایک مشترکہ کمیٹی تھی جو مجموع دربار کہلاتی تھی اور تمام دربار رعیت کے معاملات میں مجموع دربار کے فیصلوں کے پابند تھے)

ماناوَدر کے دربار نے مجموع دربار کی کمیٹی میں جو نئے لگان ومحاصل (ٹیکس) نافذ کرنے کی درخواست پیش کی ان میں سدھائے ہوئے پالتو جانور،چوپائے گائے،بھینس،بکری اور عمارتوں کی تعمیرات اور ردوبدل پر بھی لگان ومحاصل نافذ کرنے کی درخواستیں شامل تھیں۔مجموع دربار صاحب نے ان درخواستوں کو منظور کرلیا جس کے خلاف بانٹوا مجموع کی تمام رعایا میں مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی۔

ان دنوں بانٹوا میں میمنوں کی آبادی 85 سے 90 فیصد تھی۔ان کے علاوہ باقی مسلمان اور ہندو بھی بانٹوا میمن جماعت کو اپنی نمائندہ جماعت سمجھتے تھے۔اس وقت بانٹوا کے سیٹھ صالح محمد ڈدھریا نے تمام پنچائتوں، جماعتوں اور عوام کا ایک مشترکہ اجلاس طلب کیا جس میں ان نئے لگان ومحاصل کو رد کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔لیکن دربار

صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

نتیجتاً سارے بانٹوا میں علامتی ہڑتال کی گئی اور راجکوٹ کے پولیٹکل ایجنٹ اور دہلی کے وائسرائے (Viceroy) کو روزانہ 20 سے 25 ٹیلی گرام ارسال کئے جانے لگے کہ دربار صاحب کی ہٹ دھرمی کے باعث عوام کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے کیونکہ عوام کو پانی، دودھ اور کھانے پینے کی دیگر اشیا کی فراہمی میں مشکلات پیدا ہوگئی تھیں۔

اس پر دہلی سے وائسرائے نے راجکوٹ کے پولیٹکل ایجنٹ سے معاملہ پوچھا اور اسے حکم دیا کہ وہ خود بانٹوا جا کر حالات کا صحیح جائزہ لے کر رپورٹ ارسال کرے۔ راجکوٹ کا پولیٹکل ایجنٹ بانٹوا آیا تو اس نے دیکھا کہ گاؤں کی فضا پر خاموشی طاری ہے اور تمام دکانیں بند ہیں۔

ایک موچی اپنی بند دکان کے تھڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔ پولیٹکل ایجنٹ نے اس سے پوچھا ''یہ دکان کس کی ہے؟'' موچی نے جواب دیا ''جناب، یہ تو میری جوتوں کی دکان ہے۔''

پولیٹکل ایجنٹ نے کہا ''مجھے جوتوں کی ایک جوڑی نکال دو۔''

موچی نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا ''صاحب آج ہڑتال ہے اس لئے میں دکان کھول کر آپ کو جوتے نہیں دے سکتا۔''

اس زمانے میں جوتوں کی ایک جوڑی کی قیمت بمشکل ایک روپیہ ہوتی تھی۔ پولیٹکل ایجنٹ نے موچی کو ایک جوڑی کے سو روپے دینے کی پیش کش کی لیکن موچی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس سے پولیٹکل ایجنٹ کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوگیا۔

بعد میں پولیٹکل ایجنٹ نے درباروں اور دیوان کے ساتھ میٹنگ کی اور مذاکرات کئے۔ مذاکرات کے بعد اس نے شہر میں منادی کرائی کہ جو بھی دکاندار دکان نہیں کھولے گا اس کی دکان سیل کر دی جائے گی۔ لیکن بانٹوا کے شہریوں پر اس دھمکی کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور کسی نے بھی دکان نہ کھولی۔ اس دوران بھی رعیت کی جانب سے پولیٹکل ایجنٹ کو ٹیلی گرام موصول ہوتے رہے۔

ان حالات سے آخر کار پولیٹکل ایجنٹ بے زار ہوگیا۔ اس نے درباروں سے کہا کہ وہ عوام کے نمائندوں کو

طلب کر کے ان کے ساتھ کسی بھی طرح سمجھوتا کرلیں یا پھر لگان ومحاصل نافذ کرنے کا حکم واپس لے لیں۔ پولیٹکل ایجنٹ کے حکم پر آخر کار درباروں نے بانٹوا جماعت کے نمائندوں کو طلب کرلیا جن میں خاص طور پر صالح محمد ڈھریا نمایاں تھے۔ بانٹوا جماعت کے نمائندوں نے ایک ہی بات کی کہ یہ لگان ومحاصل ہمیں قبول نہیں ہیں، انہیں واپس لیا جائے۔

بانٹوا جماعت کے نمائندوں سے مذاکرات کے بعد درباروں نے بانٹوا کے تمام سیٹھوں کی میٹنگ طلب کی جس میں یوں تو انہوں نے عوامی مطالبے پر جھکتے ہوئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔ البتہ درمیانی راستہ نکالتے ہوئے کہا کہ ہم تمام لگان ومحاصل واپس لے لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بدلے میں آپ لوگ شہر میں آنے والے مال وسامان پر فی روپیہ ایک پیسہ چنگی (محصول) ادا کیا کریں۔ اس سے ہونے والی آمدنی مجموع دربار اپنے پاس نہیں رکھیں گے بلکہ یہ شہر کی صفائی، دیابتی اور اسٹاف کی تنخواہیں ادا کرنے پر خرچ کی جائے گی۔

ان مذاکرات کے بعد بانٹوا کے تمام عوام کا ایک مشترکہ اجلاس طلب کیا گیا جس میں درج بالا تجویز پیش کرتے ہوئے اس بات پر غور کیا گیا کہ چونکہ بانٹوا کے مجموع درباروں کی آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ چنگی سے جو رقم جمع ہو وہ تمام شہر کی صفائی، دیابتی اور اسکولوں کے انتظامات جیسے عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں استعمال کی جائے۔ اس طرح بانٹوا جماعت اور بانٹوا آبادی کی اس عوامی تحریک کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور یہ نظام 1947ء تک جاری رہا۔

☛ ☛ ☛

بانٹوا شاہراہ ترقی پر

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، میمن قوم کے افراد نے سب سے پہلے ملازمت کے دوران کاروبار کا تجربہ حاصل کر کے میدان تجارت میں قدم جمائے۔ چند میمنوں نے دلالی کے پیشے میں بھی پیش رفت کی اور اس طرح پورے ملک میں پھیل گئے۔ یاد رہے کہ اسی زمانے میں برما، عدن اور سری لنکا بھی حکومت برطانیہ کے زیر تسلط ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں ہی شمار ہوتے تھے اور اسی وجہ سے اسے برصغیر کہا جاتا تھا۔ بانٹوا کے سیٹھوں نے اپنے ابتدائی دور میں نوکری اور چھوٹے موٹے کاموں سے ابتدا کی تھی۔

بانٹوا کے سیٹھ صاحبان میں جن کا نام آج سرفہرست ہے قاسم دادا سرکاری اسکول میں استاد تھے۔ پیر محمد قاسم گاؤں گاؤں سے خالص گھی لا کر بانٹوا میں فروخت کرتے تھے، حاجی ابراہیم کوچین والا دھوراجی کی ایک فرم میں ملازمت کیا کرتے تھے۔

قاسم دادا نے ہالائی میمنوں کے ساتھ دیس پردیس میں متعدد نوکریاں کرنے کے بعد ''حسین قاسم دادا'' کے نام سے اپنی الگ فرم قائم کی۔ اسی طرح محمد حاجی غنی اور حاجی ابراہیم کوچین والا نے بھی اپنی اپنی فرموں کی ابتدا کی۔ دوسرے میمن بھی آزادانہ تجارت میں آنکھیں بند کر کے کودتے رہے۔

جس طرح آجکل جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں اعلان کردہ سرمایہ سے قائم ہوتی ہیں، اسی طرح اس دور میں بھی عوام الناس کے سرمایہ سے تجارتی کمپنیاں قائم کرنے کا رواج تھا۔ البتہ طریقہ کار ذرا مختلف تھا۔ حسین قاسم دادا اور پیر محمد قاسم میمنوں سے 500 روپے سے دس ہزار روپے تک بطور سرمایہ لیتے اور ہر ہزار روپے پر 50 سے 150 روپے کا منافع ادا کرتے۔

بعد میں ان کی استطاعت وتقویت وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور جس طرح ایک عام معمولی سا سپاہی

اپنی ذہانت وصلاحیت کے بل بوتے پر ملک کا حکمران ہوجاتا ہے،اس طرح میمن قوم بھی اپنی ذہانت وصلاحیت اور اہلیت واستعداد کے باعث اپنے تجارتی حلقہ کووسیع سے وسیع تر کرتی رہی اور سارے ہندوستان کے علاوہ برما،عدن، سیلون،افریقہ اور چین تک ان کی تجارت کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔

اگر چہ میمن لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے بلکہ اکثر کی تعلیم پرائمری سے بھی کم تھی مگر پھر بھی وہ اپنی خداداد ذہانت اور تجارتی صلاحیت واہلیت کے سبب اتنی شاندار ترقی کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔حسین قاسم اور حاجی حبیب پیر محمد کی فرموں کی پوری دنیا میں سوسو شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔اسی طرح حاجی پیر محمد کی تجارت کا حلقہ بھی بہت دور تک پھیلا ہوا اور بہت وسیع تھا۔ان کی فرم کی 70-75 شاخیں بڑی کامیابی اور زور وشور سے چل رہی تھیں۔

یہ تو ہوئی خاص اور بڑے سیٹھوں کی بات مگر دوسرے متعدد چھوٹے بڑے تاجر بھی اس شاہراہ ترقی پر کسی رکاوٹ و پریشانی کے بغیر گامزن رہے۔اس زمانے میں بانٹوا میں مقامی طور پر تجارت کرنے والے میمن صرف دس پندرہ فیصد ہی تھے۔بقیہ 85 فیصد ہر جگہ موجود رہنے والی فرموں میں ملازمتیں کرنے کے لئے وطن سے دور دراز کے علاقوں میں جاتے رہے۔چھوٹے پیمانے پر کاروبار کی ابتدا کر کے ترقی کی بلند ترین چوٹیاں فتح کرنے والے بانٹوا کے باسی ایک میمن کی مثال نئی نسل کو تجارت میں ترغیب اور رغبت دلانے کی خاطر پیش کر رہا ہوں۔

بانٹوا کے سیٹھ احمد داؤد نے بمبئی میں ایم صدیق کے نام سے چھوٹی سی فرم کھول کر تجارت کا آغاز کیا۔یہ فرم انڈنٹنگ (Indenting) کا کام کرتی تھی۔1938ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران قسمت کی دیوی نے ان کے ساتھ یاوری کی اور وہ نمایاں طور پر تجارتی میدان میں ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔

اس طرح بانٹوا اور اردگرد کے دوسرے گاؤں کے میمنوں نے بھی پہلی عالمی جنگ (18-1914ء) کے دوران نمایاں ترقی کی۔دوسو سال قبل بانٹوا میں آنے والے میمن خاندانوں نے جس تیز رفتاری سے اقتصادی اور سماجی ترقی کی،یہ اس کی عظیم الشان مثالیں ہیں۔لیکن ابھی ایک اور مثال رہ جاتی ہے۔

یہ مثال بانٹوا کے ہی ایک میمن حاجی کریم کایا کی ہے جو نوعمری میں تلاش معاش کے سلسلے میں افریقہ گئے۔ وہاں انہوں نے پہلے پہل ملازمت کی اور آہستہ آہستہ ایک بہت بڑے تاجر کے روپ میں سامنے آئے۔ان دنوں

بانٹوا میں تالاب کے قریب کی زمین ایک روپیہ فی گز کے حساب سے فروخت ہوتی تھی۔ یہ قطعہ زمین پانی کے کسی نالے جیسا تھا۔ جہاں متعدد میمنوں نے زمینیں خریدی تھیں۔

حاجی کریم کالیا جب ایک بہت بڑے تاجر کی حیثیت سے واپس بانٹوا آئے تو انہوں نے بھی سڑک پر زمین خرید کر ایک محل نما مکان تعمیر کرایا جو آج بھی موجود ہے۔ انہوں نے افریقہ میں دوسری شادی بھی کی تھی جس سے ان کی اولاد بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے جب اپنے فرزند کی شادی کی تو اس وقت بانٹوا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ گاؤں کے تمام لوگوں کو کھانا کھلایا گیا تھا۔

حاجی کریم کالیا کے کتنے فرزندگان زمانہ حال میں بقیدِ حیات ہیں؟ یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن ان کے پوتے حاجی عزیز کالیا کراچی کے کونسلر ہیں اور خدمتِ خلق میں مصروف ہیں۔

بانٹوا میں مقامی طور پر خصوصاً روئی، کریانہ، کپڑا، لکڑی اور اناج وغیرہ کے تاجر تھے۔ تاجروں نے دیہی علاقوں میں بھی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ مثلاً آدم مانترا والا، اینلا والا، وبکری والا، ہاشم غنی، غنی کے والد، غنی بالاگام والا۔ بانٹوا سے متصل گاؤں پاجود میں بھی میمنوں کی تجارت تھی۔ بانٹوا میں اس کے علاوہ لوہے اور ہارڈویئر کی تجارت بھی اچھی خاصی تھی۔

روئی (کپاس) کی تجارت مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ روئی کی دو تین فیکٹریاں تھیں جہاں بانٹوا کی عورتیں کپاس سے پھوئے نکالنے جاتی تھیں۔ بہت سی عورتیں کپاس گھر پر منگوا لیتی اور گھر کے سب چھوٹے بڑے افراد مل کر بھی یہ کام کرتے۔ اس کام کی مزدوری (اجرت) فی بوری اڑھائی سے تین آنے (آج کے 15 سے 20 پیسے) ملتی تھی جبکہ فیکٹری میں جا کر روئی کے پھوئے پھولنے والی عورتوں کو مزدوری چار سے پانچ آنے فی بوری ملتی تھی۔

پھوئے کی روئی کا کام خصوصاً صالح محمد ڈھریا اور حاجی قاسم وغیرہ کرتے تھے۔ لیکن بعد میں مندے کے باعث وہ کمزور ہو گئے تھے۔ ان کا ایک مسافر خانہ اس وقت محمد جھٹہ میں تھا۔ لیکن حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے مسافر خانے کی جگہ پر کرائے کے مکان بنا دیئے گئے۔

ہم نے پارسی، سورتی میمن، کچھی میمن اور ہالائی میمنوں کی تاریخ کا مطالعہ کر لیا۔ پارسی، سورتی اور کچھی

عکسِ بانٹوا

میمنوں کی نسلیں اپنے آباؤاجداد کی تجارت کی حفاظت کرنے میں زیادہ تر اس لئے ناکام رہیں کہ انہیں جائدادوں کے کرائے حاصل ہوتے تھے اس لئے انہیں تجارت پر دھیان دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور وہ تعلیم پانے کے باوجود ملازمتوں کی جانب راغب ہوگئے۔اس طرح وہ میدان تجارت سے خارج ہوگئے۔لیکن ہالائی میمنوں نے ان کا مقام حاصل کر کے تجارت میں شاندار ترقی کی۔

پاکستان میں بھی چند تاجر ترقی کر کے صنعتیں لگانے میں کامیاب رہے۔لیکن ایسے ہالائی میمنوں کی نئی نسل بھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمتوں کی جانب مڑگئی یا بیرون ملک جانے لگی۔نتیجتاً بطور ایک تاجر قوم اب ہمیں اپنا اختتام بھی سامنے نظر آرہا ہے۔صنعتیں بھی اب میمنوں کے ہاتھ سے نکلتی جارہی ہیں اور اس طرح ہم بھی بطور ایک تاجر مرتے جارہے ہیں۔

<<<< >>>>

عکسِ باتنوا

میمن قوم کا جذبہ تعمیر

میمن قوم میں جذبہ تعمیر اس قدر زیادہ ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی گئے انہوں نے مدارس اور مساجد ضرور تعمیر کرائیں۔میمن سیّدوں کے بے حد عقیدتمند تھے۔جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جاچکا ہے کہ بانٹوا میں دراصل درباروں اور سیّدوں کی ہی جاگیریں اور زمینیں تھیں۔بانٹوا کا اصل گاؤں تو چھوٹے اور بڑے دروازے تک ہی محدود تھا۔

آج اگر چہ میری یادداشت اور قوت حافظہ میرا پورا ساتھ نہیں دے رہی پھر بھی جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، تالاب کی جانب ایک دروازہ تھا اور قلعہ نما وسیع وعریض دربار گڑھ بھی تھا۔اس دروازے کی بیرونی جانب سکونت اور رہائش کی ابتداء 95-1890ء میں ہوئی تھی۔متعدد افراد چھوٹے دروازے کی طرف،سڑک کی جانب بڑے دروازے کی جانب جیل کی سمت میں اور بیرونی مسجد تالاب وغیرہ کے علاقوں میں آباد ہونے لگے۔

بیرون دروازہ سکونت اور رہائش کی ابتدا 15-1910ء میں ہوئی اور جوں جوں میمنوں کے پاس دولت کا اضافہ ہوتا چلا گیا،گاؤں بھی وسیع وعریض ہوتا چلا گیا۔پھر بانٹوا کی ترقی میں ریل نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔

1912ء میں حکومت جونا گڑھ نے سیّدوں اور درباروں سے اراضی خرید کر ریلوے اسٹیشن بنایا اور اس طرح بانٹوا کی ترقی کی رفتار تیز کرنے کا ایک اور وسیلہ حاصل ہوگیا۔

☞ ☞ ☞

بانٹوا شہر کی تعمیرات

بانٹوا میں 1900ء کے بعد بڑے دروازے کے باہر بھی سکونت شروع ہوگئی۔ جب تالاب والی زمین فروخت ہوئی تو ڈھیل تلاؤڈی کی جانب بھی لوگوں کی رہائش ہونے لگی۔ 1915ء تک کوشت مارکیٹ کا علاقہ ویران تھا۔وہاں سیّدوں کا قبرستان تھا۔

جب 1912ء میں ریلوے آئی تو اس وقت میرے دادا قاسم لوائی بانٹوا میں بلڈنگ مٹیریل یعنی لکڑی، پتھر، چونا اور فرنیچر کی تجارت کرتے تھے۔انہوں نے کوشت مارکیٹ کے پہلو میں واقع اسٹیشن کی طرف جانے والی شاہراہ پر 7000 گز اراضی سیّدوں سے 25 سال کی لیز پر 250 روپے کرایہ پر لی اور وہاں انہوں نے درج بالا کام ہی جاری رکھا۔

ان کے سامنے کی اراضی میدان تھا اور سڑک کے سامنے کی سمت بھی میدان تھا جبکہ عقبی حصے میں ڈھیڈھ قوم کی جھونپڑیاں اور کمیلا (ذبح خانہ) بھی تھا۔اس کے علاوہ ساری زمین ویران تھی۔اس ویران میدان میں صرف باہر سے آنے والے سرکس (Circus) پندرہ روز قیام کیا کرتے تھے۔ان دنوں بانٹوا کے لوگوں کے لئے سرکس ایک بہترین تفریح کے طور پر بے حد پسند کیا جاتا تھا اور لوگ بڑے شوق سے سرکس دیکھتے تھے۔

بانٹوا میں ریل آنے کے بعد اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹی سی جگہ پر مامد موٹا نے لکڑی کی لائی یعنی ٹمبر مارکیٹ کھولی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئی۔بعد میں یہ ٹمبر مارکیٹ بھی میرے دادا قاسم لوائی نے خرید لی تھی جبکہ ان کا بلڈنگ مٹیریل کا بھی کاروبار تھا۔

بانٹوا دربار کی اجازت سے انہوں نے 1931ء میں بڑے بنگلے کے سیّدوں سے ڈیڑھ روپے گز کے حساب سے اراضی خریدی تھی۔اس وقت سیدوں سے خریدی جانے والی اراضی پر 20 فیصد محصول (زرخراج) ادا کرنا

پڑتا تھا۔عام اراضی کی فروخت پر 9فیصد زرخراج دربار لیتے تھے اور درباروں کی آمدنی کا صرف یہی ذریعہ تھا۔

قاسم لوائی نے سیّدوں سے جو اراضی خریدی اس پر انہوں نے 50 مکانات تعمیر کرائے لیکن کسی میمن نے وہ مکان کرایہ پر نہ لئے تو دوسرے مسلمانوں کو کرائے پر دینے پڑے۔50 روپے سالانہ کرائے کے یہ مکانات خاص طور پر کپاس ذخیرہ کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے اور کپاس کا کاروبار کرنے والے ہی کرائے پر لیتے تھے۔

اس کے علاوہ قاسم لوائی نے روڈ پر بھی متعدد دکانیں اور ایک موٹر گیراج بنایا۔ان کے پاس اپنی تجارت کے لئے بھی بڑی جگہ تھی۔انہوں نے اپنی رہائش کے لئے بھی دومنزل والی ایک عمارت تعمیر کرائی جس میں باتھ روم اور کچن کی سہولت کے ساتھ کئی فلیٹ تھے۔وہ اور ان کے بیٹے، پوتے وغیرہ 6 فلیٹوں میں قیام پذیر تھے اور بقیہ 6فلیٹوں میں کرایہ دار رہتے تھے۔ان کے کرایہ داروں میں آدم پنکھیڈا، مامد مرسیہ، اے رحمٰن مانڈویا وغیرہ شامل تھے۔

سامنے والے میدان کی اراضی حسین قاسم دادا نے خریدی تھی۔ 37-1932ء میں انہوں نے بھی مکانات تعمیر کرائے۔اس میں سے کچھ جگہ انہوں نے حاجی پیر محمد قاسم کو بھی دی۔وہاں مسجد، اسپتال اور اس کے عقب میں مکانات تعمیر کرائے گئے۔انہوں نے اسٹیشن روڈ پر دکانیں بنانے کے علاوہ ایک پوسٹ آفس اور سینما گھر بھی تعمیر کیا۔ایک حصہ ہندوؤں کو کرائے پر دیا گیا تھا اور بقیہ حصے میں میمنوں کی رہائش تھی۔اس علاقے کا نام ''حسین پورہ'' رکھا گیا تھا۔

اسی سڑک پر دوسری زمین ریڈی والے کی تھی جو حاجی کریم برادران نے خریدی تھی۔بعد میں یہاں حاجی داؤد نونا نکیا نے لکڑی کی مارکیٹ بنائی تھی۔مکان میں وہ خود رہتے تھے اور نونا نکیا کو کرائے دار کے طور پر رکھا تھا۔اس طرح ایک اجڑا ہوا ویران میدان 1930ء میں ریلوے کی آمد کے بعد زندگی سے بھرپور علاقے میں تبدیل ہوگیا۔

تالاب والی زمین کی فروخت کے سودے تو 1910ء میں ہوئے تھے۔لیکن دومنزلہ مکانات کی تعمیر کا آغاز 1920ء میں ہوا۔اس دوران اس علاقے میں کچھ مکانات کی تعمیر بھی شروع ہوگئی تھی۔لیکن 1920ء کے بعد وہاں

تعمیری کام میں تیز رفتاری پیدا ہوئی۔ آدم سیٹھ نے اسٹیمر لائن بنا کر کرائے پر دی۔ دوسرے لوگوں نے بھی ان کے تقلید کرتے ہوئے مکانات تعمیر کرائے۔ اس طرح 1940ء تک یہ علاقہ بھی بارونق ہوگیا۔

1938ء میں کھراواڑ کی اراضی فروخت ہوئی جو سردار گڑھ اور ماناوَدر کے درباروں کی ملکیت تھی۔ اس اراضی پر حاجی حبیب پیر محمد اور دوسروں نے مکانات تعمیر کرا کے خود قیام کرنے کے علاوہ مکانات کرائے پر بھی دینے شروع کر دیئے۔ اسی زمانے میں سیٹھ احمد داوَد بھی کھراواڑ میں اپنا مکان تعمیر کرا کے وہاں قیام کرنے لگے۔ سردار گڑھ کی جو اراضی ناڈیا کے راستے پر تھی وہاں بھی سیٹھ احمد داوَد نے مکان تعمیر کرا کے کرائے پر دے دیا تھا۔

دھنا شیر سے آگے کی اراضی بھی ماناوَدر کے دربار کی تھی۔ 1940ء میں میمنوں نے وہاں چھوٹے پلاٹ خریدے اور اپنے مکان تعمیر کر کے ان میں رہائش پذیر ہوئے۔ اس علاقے کا نام ''جاسل پورہ'' رکھا گیا۔

1938ء کے بعد میمنوں کے پاس جوں جوں پیسے آتے گئے وہ اپنے لئے مکانات بناتے رہے۔ یہ میمن قوم کا بے پناہ جذبہ تعمیر و ترقی ہی تھا کہ 1947ء تک بانٹوا عمدہ اور خوبصورت مکانات کا حامل ایک حسین و جمیل شہر بن گیا تھا۔

بانٹوا میں بہت سی مساجد تھیں۔ ان میں مشہور و معروف مساجد یہ تھیں۔

دیہہ تلاوَڈی کی جانب واقع حاجی موسیٰ کی مسجد، حاجی شریف کی مسجد، دھنا شیر کے قریب کی مسجد، حسین پورہ میں حاجی پیر محمد کی مسجد، شیخا کی مسجد، مدی چیٹھہ کی مسجد، حسین سیٹھ کی مسجد، ماناوَدر کے راستے پر آنے والی مسجد، تلاوَمیں حاجی پیر محمد کی مسجد اور تلاوَمیں ہی حاجی موسیٰ کی مسجد، کھراواڑ میں حاجی یوسف زری والے کی مسجد۔

یہ ساری مساجد بیرون بانٹوا آبادی کا آغاز ہونے کے بعد تعمیر ہوئی تھیں۔ جرنا گڑھ بانٹوا میں جمعہ مسجد، منارے والی مسجد اور قلی مسجد مرکزی تھی۔ مساجد کا انتظام 1939ء تک عموماً پارچے کے تاجر یا میرے دادا قاسم لوائی کرتے تھے۔ 1939ء سے تمام مساجد کا انتظام بانٹوا جماعت کے سپرد کر دیا گیا۔ مساجد کی آمدنی کے لئے دکانیں نکالی گئی تھیں جن کے کرائے سے مسجد کے اخراجات پورے کئے جاتے۔

صرف ایک گل محمد باوامیاں کی مسجد (جو ریلوے اسٹیشن کے قریب تھی) کا انتظام باوامیاں خود کرتے تھے۔اس مسجد کے ساتھ ایک درگاہ بھی تھی۔بانٹوا کے جرنا گڑھ سے باہر ہندوؤں کا ایک مندر تھا جو بھیم ناتھ مندر کے نام سے مشہور تھا اور تلاؤڈی کے راستے پر واقع تھا۔بانٹوا کے ہندو اس مندر میں پوجا پاٹ کرتے تھے۔

بینک، ڈاکخانہ اور سینما

بانٹوا میں ٹیلی فون کی سہولت نہیں تھی۔البتہ پوسٹ آفس تھا۔آغاز میں پوسٹ آفس دھنا شیر نامی علاقے میں حاجی شریف کی مسجد کے قریب تھا بعد میں حسین پورہ میں نئی آبادی ہوئی تو یہ پوسٹ آفس وہاں منتقل کر دیا گیا۔

1940ء میں بانٹوا میں ایک بینک کھلا۔اس کا نام ABL تھا مگر یہ بینک دیوالیہ ہو گیا۔بعد میں تلاؤ کے علاقے میں حبیب بینک کی برانچ کھولی گئی جو بانٹوا میں تقسیم ہند کے وقت آخری لوٹ مار تک کام کرتی رہی۔

تلاؤ میں ہی خاموش فلموں کا ایک سینما گھر تھا۔بعد میں حسین پورہ میں کوہ نور ٹاکیز کے نام سے ایک نیا سینما گھر قائم ہوا۔پھر تلاؤ والا سائیلنٹ سینما گھر بھی ٹاکیز بن گیا۔

دکانیں اور مارکیٹ وغیرہ

بانٹوا میں ایک علاقہ کالیا داس تھا۔پہلے یہ بیرون شہر تھا جہاں تقریباً سارے ہندو کسان رہتے تھے۔جب کھراواڑ میں آبادی بڑھی تو وہ اندرون شہر کھراواڑ میں آ گیا۔

بانٹوا میں ایک سبزی منڈی تھی جو بعد میں تلاؤ کے علاقے کا ایک حصہ بن گئی تھی۔گوشت مارکیٹ اسٹیشن جانے والے راستے پر سیّدوں کی باڑی کے قریب واقع تھی۔گوشت مارکیٹ کی حد ختم ہوتے ہی میرے دادا جان قاسم لوائی کی اراضی اور لکڑیوں کی دکان (ٹمبر مارکیٹ) آتی تھی۔گل محمد کے باغ کی جانب جائیں تو راستے میں لکڑی، فرنیچر، پتھر وغیرہ کی دکانیں تھیں جہاں بعد میں میرے دادا حاجی قاسم لوائی گیراج، گودام اور رہائشی مکانات تعمیر کر کے اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔

ذرائع آمدورفت

بانٹوا میں رکشے، تانگے نہیں تھے۔ عام طور پر عورتیں اور مرد پیدل ہی آمدورفت کرتے تھے۔ البتہ تین چار ٹیکسیاں ماناوَدر، سردارگڑھ اور جوناگڑھ کی شاہراہ پر دوڑتی رہتی تھیں۔ صاحب حیثیت افراد ان ٹیکسیوں کے ذریعے سینما دیکھنے جوناگڑھ جاتے تھے۔

1940ء میں بانٹوا میں ایک تانگہ چلنے لگا۔ جو زیادہ تر اسٹیشن جانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

تاریخ بانٹوا میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کم از کم ایک دفعہ ریل اور بس کی ٹکر ہوئی تھی۔ یہ حادثہ ریلوے پھاٹک کے قریب ہوا تھا جس میں متعدد افراد جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے جاں بحق ہوئے تھے۔

بلدیات اور شہری زندگی

بانٹوا میں پانی کنویں سے یا بورنگ سے حاصل کیا جاتا تھا۔ عموماً عورتیں پانی بھرتی تھیں۔ گٹر سسٹم کا کوئی تصور تک نہ تھا۔ بھنگی اور مہتر صبح صادق کے وقت آکر بیت الخلا یا پاخانہ وغیرہ صاف کر جاتے تھے۔ یہ تھی بانٹوا کی خوش حالی۔ بانٹوا کی عام زندگی بالکل دیہی زندگی کی مانند تھی۔ شہر کی ہوا گاؤں کو نہیں لگی تھی۔ کپڑے خریدنے کے لئے عورتوں کے دکان پر جانے کا رواج نہ تھا۔ کپڑے کے تاجر اپنے ملازموں کے سر پر مال لاد کر خریداروں کے ہاں جاتے جہاں خواتین اپنی مرضی کے مطابق کپڑا پسند کر کے خریدتی تھیں۔

بانٹوا میں بجلی نہیں تھی۔ 1930ء میں ایک نجی کمپنی نے بجلی کی رسد مہیا کرنے کا آغاز کیا تھا۔ لیکن وہ کمپنی تین چار سال میں ہی دیوالیہ ہوگئی۔ اس لئے ایک مرتبہ پھر مٹی کے تیل کے دیے، بتیاں اور فانوس وغیرہ جلنے لگے۔ پیٹرومیکس کی بتیوں کا بھی رواج تھا۔ بلدیہ کے دیے بھی مٹی کے تیل سے جلتے تھے۔ یہ سب 1947ء تک چلتا رہا۔

عکسِ بانٹوا

مشترکہ خاندانی نظام

مشترکہ خاندانی نظام کی اپنی برکتیں اور رحمتیں ہوتی ہیں۔ یہ نظام انسان کے بہت سے سماجی و معاشرتی مسائل حل کر دیتا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کے تحت کمزور اور کم حیثیت کے افراد کو بھی بہتر زندگی نصیب ہو جاتی ہے۔

بانٹوا میں مشترکہ خاندانی نظام کی جڑیں بہت مضبوط تھیں، مکانات وسیع و عریض اور کھلے کھلے تھے جن میں ایک ہی خاندان کے بہت سے افراد مل جل کر رہتے تھے اور ہر فرد کی اپنی ذمہ داریاں ہوتی تھیں جو انہیں نبھانی ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں بود و باش اور رہن سہن کے انتظامی معاملات اتنے عمدہ تھے کہ لوگوں کے ذہنوں پر کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ سکون اور آسائش کے اس سنہرے دور میں نفسیاتی امراض کا کوئی وجود نہیں تھا۔

مشترکہ خاندانی نظام کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ رشتے ناطے آپس میں ہی طے کر لیے جاتے تھے۔ اگر ایک گھرانے میں چار یا چھ بھائی یا سات آٹھ بہن بھائی ہوتے تھے تو ان کی اولادوں کی شادیاں بھی آپس میں کر دی جاتی تھیں۔

بانٹوا کی میمن آبادی کے تقریباً 85 فیصد مرد معاش، تجارت یا ملازمت کے سلسلے میں ہندوستان سے باہر یا ہندوستان کے بڑے شہروں بمبئی، کلکتہ اور احمد آباد وغیرہ میں اکیلے رہائش پذیر ہوتے تھے اور ان کے بیوی بچے بانٹوا میں زندگی بسر کرتے تھے، پردیس میں مقیم مردوں کو کوئی تشویش یا فکر لاحق نہیں ہوتی تھی کیونکہ مشترکہ خاندانی نظام کے تحت ایک ہی خاندان کے لوگ پیار و محبت سے مل جل کر رہتے تھے۔

بانٹوا سے باہر یعنی ہندوستان سے باہر یا ہندوستان کے مختلف شہروں میں معاش کے سلسلے میں مقیم میمن مرد اپنی فیملی کے ساتھ رہنے کے لئے دو تین ماہ کے لئے بانٹوا آ جاتے تھے، 1900ء کی مردم شماری کے مطابق بانٹوا کی مجموعی آبادی 14 ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن میں 80 سے 85 فیصد میمن ہی تھے۔

☞ ☞ ☞

بانٹوا میں تعلیم وتربیت

ہندوستان کے بڑے شہروں کے دور دراز علاقے اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں ہمیشہ بدقسمت رہے ہیں۔ زمانہ قدیم میں بانٹوا کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ بانٹوا ابھی اس زمانے میں کاٹھیاواڑ کے دیگر شہروں کے مقابلے میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ تھا۔ یہاں تک کہ 1947ء میں بھی بانٹوا میں اعلیٰ تعلیم کی سرکاری وغیر سطح پر سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ بانٹوا کے باشندے اعلیٰ تعلیم کے لئے ترستے تھے، اعلیٰ تعلیمی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر طالب علم مڈل تک ہی تعلیم حاصل کر کے کام کاج میں لگ جاتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے شوقین طالب علموں کو اس زمانے میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے، انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے دھوراجی، امریلی یا راجکوٹ جانا پڑتا تھا۔ اپنے گھر والوں سے دوران طالب علموں کو حصول علم میں بڑی تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

دراصل اس وقت بانٹوا کے حالات ہی ایسے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں تعلیم کی اہمیت کا احساس ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لڑکا 15-14 سال کا ہوتے ہی اسے کسی سیٹھ کے پاس ملازمت دلا کر 100-50 روپے سالانہ کمانے کے لئے بیرون ملک بھیج دیا جاتا۔ یہ لڑکا اسی ملازمت کے دوران اپنی ذہانت اور دانش مندی سے ترقی کرتے کرتے تاجر بن جاتا۔

اس طرح دوسروں کی نوکری کر کے اپنی کاروباری زندگی کا آغاز کرنے والا خود تاجر بن کر دوسروں کو اپنے پاس ملازم رکھنے لگتا۔ ان لوگوں میں تجارت کے سوا کسی دوسرے پیشے میں شاذ و نادر ہی دلچسپی پیدا ہوتی اور اسی وجہ سے وہ تعلیم کی اہمیت سے انجان و بے خبر ہی رہتے تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا معاملہ لڑکوں سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ وہ قرآن شریف (ناظرہ) ختم کر کے پرائمری کی صرف ایک ہی کتاب کی تعلیم لے سکتی تھیں۔ اس سے زیادہ پڑھانے کا ان کے والدین تصور تک نہ کر سکتے تھے۔ بانٹوا میں ایک سرکاری اسکول اور ایک سرکاری دواخانہ (ڈسپنسری) تھا۔ اس کے علاوہ ایک پرائیوٹ اسکول من سکھ نامی استاد چلاتے تھے۔ کہنے کا مقصد ہے کہ بانٹوا میں بعض معلم پرائیویٹ

اسکول چلاتے تھے۔ من سکھ کے علاوہ لولیا نامی ایک معلم بھی اپنا پرائیویٹ اسکول چلاتے تھے۔ ان پرائیویٹ اسکولوں کی فیس آٹھ آنے سے ایک روپیہ ماہانہ تک تھی۔ لیکن سرکاری اسکولوں میں تعلیم مفت ملتی تھی۔

مدرسۂ اسلامیہ نامی مشہور اسکول ماناوَدر کو جانے والی سڑک پر واقع تھا۔ وسیع و عریض رقبہ پر پھیلے ہوئے اس اسکول کی تعمیر 1910ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے ہیڈ ماسٹر عبدالمطلب صاحب تھے۔ ان کے علاوہ مسجد کے ایک پیش امام بھی استاد تھے۔ اس طرح کل دو مسلمان اس میں پڑھاتے تھے جبکہ باقی تمام معلم ہندو تھے۔ میں نے اس اسکول میں تقریباً چار کتابیں پڑھی ہیں۔ اس اسکول کے منتظم حاجی آدم حسین قاسم تھے۔ ماہانہ فیس دو سے چار آنے تھی۔ یتیم خانہ اسکول سے ہی منسلک تھا جس میں 25-20 یتیم بچے پرورش پا رہے تھے۔ اس کے منتظم بھی حاجی آدم حسین قاسم تھے۔

بانٹوا میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ صرف حاجی آدم حسین قاسم کی رہائش گاہ سے آگے گلی کی مسجد کے بالائی حصے میں لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا اور عقب میں گجراتی سکھانے کا انتظام تھا جس میں تمام استاد ہندو تھے۔ بعد میں اندرون شہر لڑکیوں کے لئے بھی ایک اسکول قائم کیا گیا۔ اس کا انتظام آدم حسین، قاسم دادا اور دوسرے اراکین کرتے تھے۔ لڑکیوں کے اس اسکول کی نگران میمن قوم کی مادرِ ملت کے طور پر مشہور ہونے والی بزرگ خاتون خدیجہ حاجیانی تھیں لیکن بعد میں کچھ اختلافات پیدا ہونے کی وجہ سے انہوں نے لڑکیوں کے لئے خراواڑ میں ایک الگ اسکول شروع کیا۔ اس کے انتظامات بھی وہ خود ہی کرتی تھیں۔ بانٹوا میں ہر اسکول میمنوں کے فنڈ سے ہی چلتا تھا۔

1934-36ء کے سالوں میں بانٹوا کے دو میمن جوان دوسرے علاقے سے میٹرک پاس کر کے بانٹوا آئے تھے جس میں ایک مشہور و معروف قانون دان جناب جان محمد داؤد تھے۔ انہیں اور ان کے والدین کو سپاس نامہ پیش کرنے کے لئے محمڈن لائبریری اور پبلک روڈ پر حسین سیٹھ کی مسجد کے قریب جلسے کا انتظام کیا گیا۔ سب لوگ خوش تھے۔ مگر کسی نے بھی یہ ضرورت محسوس نہ کی کہ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کا انتظام بانٹوا میں ہی کر لیا جائے تا کہ بانٹوا کے لڑکوں کو میٹرک کرنے کے لئے بانٹوا سے باہر نہ جانا پڑے۔ تجارت اور کاروبار میں دلچسپی کے سبب تعلیم کی اہمیت کا کسی کو احساس ہی نہ ہوتا تھا۔

تعلیم کے پس منظر میں ایک بات کہنے کی جسارت کر رہا ہوں۔وہ یہ کہ آج کل کا دور بانٹوا کے دور سے مختلف ہے۔اس زمانے میں تعلیم کی بے حد ضرورت تھی تب میمن لوگ کاروبار اور تجارت کو ترجیح دیتے تھے۔جبکہ آج کل اپنی برادری میں ڈاکٹرز،وکلا،انجینئرز وغیرہ کثیر تعداد میں ہیں اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن آزاد تجارت اور کاروبار کی طرف رجحان بہت کم ہوگیا ہے۔

بطور وکیل یا ڈاکٹر تو اب بھی اپنے لوگ آزادانہ پیشہ کر رہے ہیں لیکن انجینئر،آرکیٹکٹ یا اکاؤنٹنٹ کے طور پر تو وہ ملازمت کی حد تک ہی رہ گئے ہیں۔اگر چہ اپنی ہنر مندی کو آزادانہ پیشہ میں بہت اچھی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔لیکن اس سمت میں غور و فکر تک کرنے کی زحمت اٹھانے کے لئے بھی اپنی برادری تیار نظر نہیں آتی۔

کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمیں تعلیم حاصل کرنے کے بعد چھوٹی فیکٹری اور صنعت یا انکم ٹیکس پریکٹیشنر کے طور پر پیش قدمی کرنی چاہیے۔اسی طرح ہی بطور ایک میمن ہم اپنے ضمیر و خودی کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔کسی بھی بلند عہدہ پر ملازمت کرنے والا صرف اپنے ہی خاندان کی کفالت و گزارہ کر سکتا ہے۔لیکن چھوٹے پیمانے پر آزادانہ کمائی کرنے والا انسان دوسرے چار پانچ خاندانوں کی بھی اپنی کمائی سے کفالت کر سکتا ہے۔

عکسِ بانٹوا

☛ ☛ ☛

بانٹوا کی جماعتی زندگی

آیئے اب بانٹوا کی جماعتی زندگی ملاحظہ کرتے ہیں۔بانٹوا میں خاص طور پر چھ ادارے تھے جن میں سے ایک ادارہ بانٹوا جماعت کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔دوسرا ادارہ انجمن حمایت اسلام تھا۔تیسرا ادارہ بانٹوا خدمت کمیٹی تھی جس کا قیام 1930ء میں عمل میں آیا۔چوتھا ادارہ لڑکیوں کا مدرسہ تھا جسے مدرسۂ اسلامیہ چلاتا تھا اور وہ بچیوں کی تعلیم کے شعبہ میں سرگرم عمل رہتا تھا۔پانچواں ادارہ تھا محمڈن لائبریری جبکہ چھٹا ادارہ ''رونق اسلام'' کے نام سے خدیجہ حاجیانی نے قائم کیا تھا۔

بانٹوا کے ان تمام اداروں میں جماعتی زندگی میں نمایاں کردار ادا کرنے والی بانٹوا جماعت تھی جو طلاق، شادی نکاح، ناراضگی و رنجیدگی وغیرہ تمام قسم کے معاشرتی مسائل حل کرنے میں مصروف رہتی تھی۔بانٹوا جماعت اس زمانے میں معاشرے میں موجود برائیوں پر قابو پانے کے کام کے ساتھ نکاح کے وقت نکاح کا اجازت نامہ (نکاح کی پرچی) بھی دیتی تھی۔یہ تمام امور یوں تو ابتدا سے ہی جماعت سرانجام دیتی تھی لیکن 1930ء سے وہ یہ امور باقاعدہ اور منظم طریقے سے انجام دینے لگی۔

اس زمانے میں بانٹوا میں شادیاں رات کے وقت ہوتی تھیں اور شادی بیاہ کی رسومات پر بہت زیادہ اخراجات ہوتے تھے۔شادی کے پروگراموں میں بینڈ باجے کے علاوہ رقاصائیں اور پھول بیچنے والیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔لیکن بعد میں ناچ گانے اور رقص و سرور کی محفلوں پر بانٹوا جماعت نے پابندی عائد کر دی۔

بانٹوا میں ایک رسم ''موڈا چوڈا'' تھی۔اس رسم میں سمدھیانہ والوں کو ہاتھ میں رقم دی جاتی تھی۔بانٹوا جماعت نے اس رسم پر بھی پابندی عائد کر دی۔اس کے علاوہ جہیز (وہ سامان جو بیٹی کی شادی میں والدین کی طرف سے بیٹی کو دیا جاتا ہے) دینا بھی ممنوع تھا۔کوئی بھی 250 روپے سے زائد مالیت کا جہیز نہ دے سکتا تھا۔اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے پر جرمانہ عائد کیا جاتا تھا۔اس کے باوجود بھی قانون شکنی کے واقعات رونما ہوتے رہتے تھے۔رشتہ طے کرانے والی بہنیں اس وقت بھی موجود تھیں جو رشتہ کرانے کی فیس 10 روپے سے 25 روپے تک لیتی

تھیں۔اس زمانہ میں لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کو کم از کم 100 تولہ سونے کے زیورات دینے پڑتے تھے۔

بانٹوا میں محرم کے تعزیہ پر منت چڑھانے پر پابندی تھی اور میمنوں کو تعزیہ بنانے کی بھی ممانعت تھی۔ خدمت کمیٹی والے ان قوانین کی سختی سے نگرانی کرتے تھے۔کوئی عورت تعزیہ دیکھنے جاتی یا تعزیہ پر منت چڑھاتی تو فوراً اس کا نام لکھ کر بانٹوا جماعت کو ارسال کر دیا جاتا۔جماعت اس پر بھی جرمانہ عائد کرتی تھی۔اس کام میں مرحوم آدم سیٹھ کافی سرگرم اور مستعد رہتے تھے اور جماعت کے قوانین پر عمل کرانے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔

☛ ☛ ☛

عکسِ بانٹوا

بانٹوا کے تہوار

1۔تعزیہ داری پر پابندی

چونکہ بانٹوا میں تعزیہ بنانے اور تعزیوں پر منت چڑھانے پر پابندی عائد کی گئی تھی اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں پر جرمانہ عائد کیا جاتا تھا،اس وجہ سے جماعت کے ساتھ سیّدوں اور درباروں کی ناراضگی اور رنجیدگی بڑھ گئی۔اس پابندی کی وجہ سے وہ دشمنی پر بھی اتر آتے تھے۔بانٹوا کے چاروں درباروں کے تعزیے جلوس کی شکل میں نکلتے تھے۔بعد میں ماناوَدر کے دربار نے تعزیے بنانے اور نکالنے پر پابندی لگادی تھی۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ماہ محرم میں ایک مولانا صاحب وعظ کرنے کے لئے بانٹوا آئے اور انہوں نے اپنے وعظ میں تعزیے کو ماننے کی اسلام میں ممانعت ہونے کا ذکر فرمایا۔اس موضوع پر بیرونی مساجد میں بھی وعظ ہوئے تھے جس کے باعث سیّدوں اور دوسرے لوگوں میں اشتعال پیدا ہوگیا۔سیّدوں نے نواب شیر بلد خانجی کے پاس جا کر فریاد کی اور کہا کہ میمن خود اس عالم کو طلب کر کے اس قسم کے وعظ کراتے ہیں جو خلاف دین و مذہب ہے۔اگر اس سلسلے کو بند نہ کیا گیا تو فساد ہوسکتا ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ اس عالم دین کو میمنوں نے طلب نہیں کیا تھا بلکہ ماناوَدر کے دربار نے اسے بانٹوا بھیجا تھا اور اس معاملے میں بانٹوا کی انجمن حمایت اسلام کے اراکین نے مخصوص کردار ادا کیا تھا۔بہر حال شیر بلد خانجی جو خود بانٹوا تعلقہ کے دربار تھے۔انہوں نے بانٹوا کے میمن سیٹھوں کو طلب کیا اور ہدایت کی کہ مذکورہ بالا عالم دین کو واپس بھیج دیا جائے۔ورنہ مار کٹائی ہونے کا خطرہ ہے۔چنانچہ اس عالم دین کو موٹر میں بٹھا کر ماناوَدر بھیج دیا گیا۔

ماناوَدر کے دربار مانگرول کے دربار کے نواسے تھے۔مانگرول کے دربار سخت مذہب پرست تھے۔اگر چہ مانگرول میں بھی اس وقت تعزیہ نکالنے کا رواج تھا۔لیکن بعد میں مانگرول کے دربار نے اسے بند کرادیا تھا۔

2۔عذاب الٰہی یا بیماری

اس کے بعد ایک عجیب وغریب واقعہ رونما ہوا۔تعزیہ داری بند ہو جانے کے تقریباً تین سال بعد مانگرول میں پلیگ (Plague) یعنی طاعون کا مرض نمودار ہوا۔اس پر تمام قوموں کے نمائندوں نے مانگرول کے دربار کے پاس جا کر دہائی دی۔

''صاحب! آپ نے تعزیہ داری بند کرائی اس لئے آئمہ ہم سے خفا ہو گئے ہیں اور ہم پر پلیگ بیماری کی صورت میں عذاب نازل ہوا ہے۔اس لئے جلد از جلد توبہ واستغفار کیا جائے اور تعزیہ داری شروع کر دی جائے۔''

لیکن مانگرول کے دربار صاحب کسی اور ہی مٹی سے بنے ہوئے تھے۔انہوں نے کہا''جہاں تعزیہ داری کا رواج جاری ہے وہاں بھی یہ مرض پھیلا ہوا ہے۔دوسری بات یہ کہ تعزیہ داری تو میں نے بند کرائی ہے۔اس حساب سے گناہگار تو میں ہوا ہوں۔اس کے باوجود مجھ پر اور میرے خاندان پر اللہ کا فضل وکرم ہے۔ہم میں سے کوئی اس مرض میں مبتلا نہیں ہوا ہے۔چاہے کچھ بھی ہو جائے میں تعزیہ داری شروع نہیں کروں گا۔''

بعد میں ماناوَدر کے دربار صاحب نے بھی مانگرول کے دربار کے عزم وارادے سے ترغیب حاصل کرتے ہوئے تعزیہ داری بند کرادی۔

بانٹوا مجموع کیتین حصہ دار تھے۔ماناوَدر کا حصہ 50 فیصد،سردارگڑھ کا25فیصد،بانٹوا کا بھی 25 فیصد تھا۔ان تمام تعلقوں کے شراکت دار اپنی شراکت اور حصے کے مطابق تعزیوں کے جلوس نکلواتے اور چوکارے ڈلواتے جس کے اخراجات تینوں حصہ دار برداشت کرتے تھے۔

شیر بلد خانجی بانٹوا دربار کے فرزند شیر خانجی جلوس کے ساتھ چلتے اور جلوس کی قیادت کرتے تھے۔احمد ٹین والے کی دکان پر چائے نوش فرمانے کے بعد وہ واپس چلے جاتے۔بعد میں تعزیوں کو قبرستان میں رکھ دیا جاتا۔

بانٹوا میں محرم کے تہوار کی بڑی عظمت وحرمت ہوتی تھی اور یہ تہوار پورے احترام سے منایا جاتا تھا۔تعزیوں کے علاوہ سیجیں بھی نکالی جاتی تھیں۔اس کے علاوہ ہاتھی بھی بنائے جاتے اور ہاتھی بنانے والے اپنے اپنے ہاتھی اٹھا کر جلوس میں آمنے سامنے جنگ چھیڑتے۔مرد عورتیں اور بچے تعزیوں اور سیجوں کے سامنے لوٹتے،لڑھکتے۔

ہاتھ میں ناریل پکڑ کر لوٹتے لڑھکتے ہوئے منتیں مانی جاتیں۔

ہماری نانی اماں نے بھی ہمارے ہاتھ میں ناریل پکڑوا کر اسی طرح ہمیں بھی لوٹایا اور لڑھکایا تھا۔اس وقت میری عمر دس سال تھی۔اس کے علاوہ بانٹوا میں شربت پلائے جاتے،پانی کی سبیلیں لگائی جاتیں اور مجالس منعقد کرائی جاتی تھیں۔محرم کے ابتدائی دس دنوں میں مساجد میں وعظ ہوتا تھا جس میں محرم کی عظمت وحرمت اور کربلا کے واقعات پر روشنی ڈالی جاتی۔

3۔عید میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم

محرم کے علاوہ عید میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بانٹوا میں بڑے احترام اور جذبے سے منائی جاتی تھی۔ عید میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم جو بارہ وفات کے نام سے معروف تھی،اس میں بڑی چہل پہل اور رونق ہوتی تھی۔ بانٹوا کے تمام مسلمان اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم میلا د انتہائی مسرت وشادمانی سے مناتے۔ربیع الاول کے پہلے بارہ دنوں میں بانٹوا کی مساجد میں وعظ ہوتا اور میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلیں منعقد کی جاتیں۔ جلوس نکالے جاتے اور مٹھائیاں بانٹی جاتیں۔

اسی طرح گیارھویں شریف بھی بڑے جوش وجذبے سے منائی جاتی۔اس مہینے کے پہلے گیارہ دنوں میں وعظ کی محفلیں منعقد کی جاتی تھیں اور دودھ بانٹا جاتا تھا۔تمام وعظوں کے لئے مولوی صاحبان باہر سے آتے تھے۔ان کے علاوہ بانٹوا کے مقامی مولانا ابراہیم نگریا بھی وعظ فرماتے۔

4۔ماہ رمضان المبارک

عید میلا النبی صلی اللہ علیہ وسلم،گیارہویں شریف اور محرم الحرام کی طرح بانٹوا میں ماہ رمضان بھی بڑے شوق اور احترام واہتمام سے منایا جاتا تھا۔بانٹوا کے مسلمان رمضان المبارک کی اہمیت وعظمت سے بخوبی واقف تھے۔ہمارے دادا جان نے ماہ رمضان کے دوران کھچڑی پکوا کر حاجی موسیٰ کی مسجد میں غریبوں کو سحری کرانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔حاجی احمد سندھی کھچڑی پکاتے اور غریبوں ناداروں میں تقسیم کرتے تھے۔

ہمارے دادا جان قاسم لوائی نے کھچڑی بانٹنے کا یہ سلسلہ 25 سال تک جاری رکھا۔بعد میں 1940 میں

حاجی غنی اوجری وغیرہ پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دے کر سحری کے علاوہ افطاری کا بھی سلسلہ شروع کیا گیا اور مسجد کی بجائے جماعت خانے میں سحری اور افطاری کا انتظام کر دیا گیا۔

یوں تو پورا سال بانٹوا میں فقیروں بھکاریوں کی آمد جاری رہتی تھی۔لیکن ماہ رمضان میں ان کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا اور 18 ویں روزے سے فقیروں کی ٹولیاں بانٹوا پر ٹوٹ پڑتی تھیں۔ان کے کھانے پینے کا انتظام جماعت خانے میں کیا جاتا جس کے لئے لوگ چندہ جمع کرتے اور اس سے ان کو کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔

اسلامی تہواروں پر وعظ کے لئے باہر سے آنے والے علماء عام طور پر میرے دادا قاسم لوائی کے یہاں قیام کرتے۔قاسم لوائی بے حد مذہب پرست انسان تھے۔وہ علماء کے لئے طعام وقیام اور دوسری ضرورتوں کا پورا خیال رکھتے تھے۔

مولانا صاحبان نے قاسم لوائی کے دل ودماغ میں یہ بات بٹھادی تھی کہ کوئی میمن اپنے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کے علاوہ تین چار جماعتوں سے زیادہ تعلیم نہ دلائے۔یہ مولوی صاحبان اپنے وعظوں میں بھی سرعام انگریزی زبان کے خلاف تبلیغ کرتے اور فرماتے کہ انگریزی نصرانی یعنی عیسائیوں کی زبان ہے،جو کوئی بھی اپنے بچوں کو انگریزی زبان پڑھائے گا یا انگریزی لباس پہنائے گا وہ روز قیامت عیسائیوں کے ساتھ اٹھے گا اور اس کا شمار مسلمانوں کی بجائے عیسائیوں میں ہوگا۔

ہمارے دادا قاسم لوائی اور دوسرے مسلمان ان باتوں پر برابر عمل کرتے تھے۔قاسم لوائی نے مولانا صاحبان کی ہدایت کے مطابق ہمارے بھائی رحمت اللہ کو تین جماعت تک تعلیم دلائی اور انہیں حافظ قرآن بنانے کی کوشش کی لیکن ہمارے بھائی حافظ نہ بن سکے۔وہ صرف چند سپارے ہی حفظ کر پائے۔

جب میری عمر بارہ سال ہوئی اور میں نے چوتھی جماعت پاس کرلی تو مجھے بھی اسکول سے اٹھالیا گیا اور قرآنی تعلیم کے لئے بٹھادیا گیا۔لیکن اس طرف میرا کوئی خاص رجحان نہ تھا بلکہ میں اخبارات اور کتب بینی میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا جس سے میری جنرل نالج میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

☞ ☞ ☞

بانٹوا کے چند یادگار واقعات

1۔سر آغا خان کی گولی

میری یادداشت میں ایک مزے دار واقعہ محفوظ ہے۔ایک بار اسماعیلی برادری کے روحانی پیشوا سر سلطان آغا خان نے بانٹوا جماعت کو کھانے پکانے کی بہت سی دیگیں عنایت کی تھیں۔بات یوں ہوئی تھی کہ 1910ء میں سر سلطان آغا خان صاحب شکار کھیلنے کے لئے بانٹوا تشریف لائے تھے۔مگر ان کی بندوق سے نکلنے والی ایک گولی بانٹوا کی عیدگاہ مسجد کو جا لگی اور مسجد کی دیوار پر نشان پڑ گیا۔اس پر سر آغا خان نے معذرت کا اظہار کیا اور خیر خواہی و خیر اندیشی کی علامت کے طور پر بانٹوا جماعت کو بہت ساری دیگیں تحفتہً عنایت کیں۔

2۔ایک میمن کا قتل

لطیف نامی ایک میمن کا بانٹوا میں قتل ہوا تو قتل کے الزام میں چار سیّدوں پر مقدمہ چلا اور راجکوٹ کے سیشن جج نے ان چاروں کو پھانسی کی سزا سنائی۔اس مقدمے کے دوران پمفلٹ بھی جاری ہوئے جس میں مقدمے کی کاروائی کی تفصیل پیش کی جاتی تھی۔

پھانسی کے فیصلے کے خلاف سیّدوں نے ہائی کورٹ میں جوڈیشنل کمشنر کے سامنے اپیل پیش کی تھی۔سیّدوں کی جانب سے محمد نام کے ایک وکیل کو رکھا گیا تھا۔اس وکیل نے ایسے قوی دلائل دیئے کہ چاروں سیّدوں کو بے گناہ قرار دے کر رہا کر دیا گیا۔بعد میں مقتول لطیف کے ماموں اس فیصلے کے خلاف دہلی کی سپریم کورٹ میں گئے۔لیکن سپریم کورٹ نے ان کی اپیل خارج کر دی۔میری رائے کے مطابق اس مقدمے میں سیّد صاحبان بے گناہ ہی تھے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی دوسرے گناہ کی سزا اس طرح دی تھی۔کہا جاتا ہے کہ اس مقدمے میں ایک مقتدر (صاحب اقتدار) شخص نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

3۔عرس اور میلہ

بانٹوا سے کچھ فاصلے پر الگام تھا۔وہاں ایک ولی اللہ کی درگاہ تھی جہاں ہر سال عرس ہوتا تھا اور بانٹوا سے لوگ بڑے جوش وخروش کے ساتھ عرس میں شرکت کرنے کے لئے جاتے تھے۔وہاں منتیں بھی مانی جاتی تھیں اور مزار پر چادریں بھی چڑھائی جاتی تھیں۔پرانے گاؤں سے باہر مانا وَدر کی شاہراہ پر پیر بخاری شاہ باوا کی درگاہ تھی جس کی بڑی اراضی تھی اور اس کے اطراف میں کمپاؤنڈ وال یعنی چاردیواری بھی تعمیر کی گئی تھی۔بانٹوا کے علاوہ جرنوج میں بھی ایک درگاہ تھی اور وہاں بھی ہر سال عرس ہوتا تھا جس میں بانٹوا کے عقیدت مند شرکت کرنے جاتے تھے۔سردار گڑھ میں بھی عرس میلہ لگتا تھا جہاں جواء وغیرہ کھیلنے کی اجازت تھی۔بانٹوا سے وہاں بھی کافی لوگ جاتے تھے۔

عکسِ بانٹوا

قائداعظم بانٹوا کے خصوصی دورے پر

1940ء کا عشرہ تحریک پاکستان کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل تھا اور اسی عشرے کے آخر یعنی 1947ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔ 1940ء میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی دھوم پورے ہندوستان میں مچی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریروں اور بیانات سے مسلم قوم میں بیداری کی ایک انوکھی لہر پیدا کردی تھی اور ہر طرف یہ نعرے گونج رہے تھے۔ پاکستان کا مطلب کیا "لا الہ الا اللہ" "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" "بٹ کے رہے گا ہندوستان بن کے رہے گا پاکستان" تحریک پاکستان کے اثرات بانٹوا تک پہنچ گئے تھے اور وہاں کی میمن برادری میں بھرپور جوش وجذبہ ابھر آیا تھا۔ بانٹوا کے میمن نوجوان، بوڑھے بلکہ بچے تک تحریک پاکستان میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے بے چین اور بیتاب تھے۔

جوش اور جذبے کی اس گرمجوش فضا میں قائداعظم "لیگ پریس فنڈ" کے حصول کے سلسلے میں 24 جنوری 1940ء کو بانٹوا تشریف لائے، فنڈ جمع کرنے کے لئے قائداعظم کا کاٹھیاواڑ کے کسی بھی شہر کا یہ پہلا دورہ تھا۔ بانٹوا میں فنڈ ریزنگ میں شاندار کامیابی کے بعد قائداعظم نے کاٹھیاواڑ اور گجرات کے دیگر شہروں کا دورہ کیا۔

بانٹوا میں قائداعظم کا فقید المثال اور انتہائی پرجوش استقبال کیا گیا۔ قائداعظم جب جلوس کی شکل میں بانٹوا پہنچے تو پورا شہر امڈ آیا تھا، یہ وہ عجیب جذباتی لمحات تھے جو کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔ قائداعظم اپنے والہانہ استقبال سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اس رات قمقموں کی رنگ برنگی روشنی میں مدرسہ اسلامیہ کے وسیع وعریض میدان میں عوامی جلسے کا انتظام کیا گیا تھا، جلسہ گاہ میں مسلمانوں کا خوشیوں بھرا جذبہ قابل دید تھا اور ایسا منظر بانٹوا کی تاریخ میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا نعروں کی گونج میں سیٹھ آدم حاجی پیر محمد نے اہلیان بانٹوا کی جانب سے قائد اعظم کو خطبہ استقبالیہ پیش کیا جس میں انہیں بانٹوا کے مسلمانوں کی جانب سے ہر قسم کے تعاون محبت اور قربانیوں کی یقین دہانی کرائی گئی۔ اس جلسے کے بعد بانٹوا کے میمن رہنماؤں نے اس امر کا اظہار کیا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت قیام پاکستان کو روک نہیں سکتی۔ جلسے میں قائداعظم نے بڑی موثر اور جذباتی تقریر کی جس پر مسلمانوں نے زبردست نعرے لگائے، تقریر میں قائداعظم نے بتایا کہ وہ لیگ پریس فنڈ اکٹھا کرنے بانٹوا آئے ہیں، بانٹوا کے مسلمانوں نے

قائداعظم کی اس اپیل پر لبیک کہا خطیر رقم کا چندہ جمع ہوگیا جو آج کے کروڑوں روپے کے برابر تھا۔

قائداعظم نے بانٹوا میں تین دن قیام کیا اور اس دوران مانا ودر روڈ پر واقع حسین قاسم دادا کے **خوبصورت** بنگلے میں مقیم رہے۔ اپنے تین روزہ قیام کے دوران قائداعظم نے پیر محمد قاسم کلکتہ والا چیریٹیبل ہسپتال کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی اور ممتاز میمن تاجر سیٹھ محمد حاجی غنی بالاگام والا کی عیادت کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ قائداعظم کا دورہ بانٹوا تحریک پاکستان کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ بانٹوا میں جمع کئے گئے فنڈ سے انگریزی اخبار ڈان کا اجراء ہوا جو پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی آواز بن گیا۔

☚ ☚ ☚

عکسِ بانٹوا

بانٹوا انجمن کی خدمات

بانٹوا میں میمن قوم کی فلاح و بہبود اور قوم کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی۔ چنانچہ 1910ء میں ولی محمد حاجی دادا نے قوم کے دوسرے ہمدردوں کو ساتھ ملا کر "مسلم اتحاد" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ چند سالوں بعد اس ادارے کا نام تبدیل کر کے نیا نام "انجمن حمایت اسلام" رکھا گیا اور وہی بطور بانٹوا انجمن مشہور رہا۔ اس کے عہدہ داروں میں مشہور میمن سیٹھ حاجی کریم منی اور سلیمان بھورا وغیرہ تھے۔ یہ انجمن بانٹوا جماعت کے مخالف ادارے کا کردار ادا کرتی تھی۔ ہم تجارت کے لئے بانٹوا میں ہی تقریباً سارا سال قیام کرتے تھے۔ اس وقت میرے والد اور چچا بھی بانٹوا انجمن کے عہدہ دار تھے۔

ویسے تو انجمن نے قبرستان کا کام سنبھال رکھا تھا اور یہ کام ہمارے خاندان کے سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن انجمن کا اصل کام تو جیسے بانٹوا جماعت کی غلطیاں تلاش کرنے اور اس کی خامیوں پر نگاہ رکھنا تھا۔ قربانی کی کھالیں پہلے تو بانٹوا جماعت جمع کرتی تھی مگر بعد میں یہ کام بھی انجمن کے سپرد کر دیا گیا۔ قربانی کے دنوں میں انجمن کے پاس جو رقم جمع ہوتی، وہ انجمن کی طرف سے بیوہ خواتین میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ان دنوں بانٹوا میں خواتین کے لئے نہ تو کوئی زنانہ اسپتال یا دواخانہ تھا اور نہ ہی کسی لیڈی ڈاکٹر کا انتظام تھا۔ اس لئے بانٹوا انجمن نے مجموعہ دربار سے زنانہ دواخانے کے لئے برائے نام قیمت پر اراضی خریدی۔ سیٹھ صاحبان میں سے کسی نے بھی اس دواخانے کے لئے فنڈ یا چندہ نہ دیا۔ بھائی سلیمان بھورا اس وقت پردیس میں تھے۔ وہ وہاں سے تھوڑا سا فنڈ لے آئے۔ اسی طرح خواتین کے دواخانے کا آغاز کیا گیا۔ اس دواخانے کے لئے لیڈی ڈاکٹر کا بھی انتظام کیا گیا اور فیس بھی بہت معمولی یعنی دو آنہ رکھی گئی۔

بعد میں اس دواخانے سے ملحقہ اراضی بھی بانٹوا مجموعہ دربار سے چار روپیہ فی گز کے حساب سے خرید لی گئی۔ لیکن فنڈ میں کمی کے سبب اس زمین کا کچھ حصہ حبیب سیٹھ کے بھانجے مامد سیٹھ کو فروخت کر کے فنڈ پورا کر لیا گیا۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں سے فنڈ حاصل کر کے اس دواخانے (اسپتال) کو وسیع کیا گیا۔ اس موقع پر بھی بانٹوا کے سیٹھ صاحبان سے فنڈ نہ ملا۔ اسپتال کی تعمیر کے آغاز سے پہلے اس کا سنگ بنیاد رکھنے کی رسم راجکوٹ کے انگریز

پولیٹکل ایجنٹ نے ادا کی۔ دوسری مرتبہ مجموع دربار صاحبان کو سپاس نامہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن مانا وَدر کے دربار صاحب تشریف نہ لائے۔ کیونکہ انہیں بانٹوا تعلقہ کے نواب شیر خان اور دوسروں کے ساتھ ہم نشینی گوارا نہ تھی۔

چنانچہ بانٹوا مجموع کے دوسرے درباروں کو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد جناب سلیمان بھورا اور دوسرے سربراہان انجمن مانا وَدر کے دربار صاحب کے پاس گئے اور انہیں اکیلا مدعو کرنے کی ان کی شرط قبول کر کے ان کے لئے دوسرے جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس طرح انہیں بھی سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ انجمن کو ان کی خوشنودی کے لئے خصوصی طور پر جلسہ منعقد کرنا پڑا۔

☛ ☛ ☛

عکسِ بانٹوا

بانٹوا کے مذہبی معاملات

بانٹوا میں اس وقت 80 سے 85 فیصد آبادی میمنوں کی تھی۔ وہ مسلمان تھے اور شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ قبرستان اور دواخانے کے علاوہ انجمن کا اہم کام میمنوں پر ''محمڈن لاء'' لاگو کیا جائے' کے لئے تحریک چلانے کا تھا۔ تینوں معاملوں کا میں الگ الگ ذکر کروں گا۔

محمڈن لاء لاگو کرنے کا اختیار بانٹوا دربار کے پاس تھا۔ لیکن اس معاملے میں انجمن کا ایک بار پھر بانٹوا جماعت سے ٹکراؤ ہو گیا۔ بانٹوا جماعت پر سیٹھ صاحبان کا غلبہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ محمڈن لاء درکار ہو تو اعلان کیا جائے اور یہ قانون سب پر جبراً لاگو نہ کرایا جائے۔ جماعت والوں نے حسین سیٹھ، آدم سیٹھ اور حبیب مکنا کی دکان پر آدمیوں کو بھیج کر دستخط لینے کا آغاز کر دیا۔ پھر ان دستخطوں کی فہرست انہوں نے دربار صاحبان کے اجلاس میں پیش کی۔

دوسری طرف انجمن نے بانٹوا کے میمنوں کا جلسہ عام طلب کیا جس میں یہ تحریک و تجویز منظور کی گئی کہ دو مختلف قوانین کا نفاذ ناقابل عمل ہے اس لئے بانٹوا کے تمام میمن عوام پر محمڈن لاء لاگو کیا جائے۔ اس تحریک پر تمام لوگوں کے دستخط بھی لئے گئے۔ دستخط لینے کی تحریک دونوں طرف سے وسیع پیمانے پر چلائی گئی مگر انجمن نے جماعت کی نسبت زیادہ لوگوں کے دستخط حاصل کئے۔

یہ معاملہ انگریز پولیٹکل ایجنٹ کے علم میں آچکا تھا۔ اس نے مجموع دربار صاحبان کو حکم بھیجا کہ اپنے فیصلے کے متعلق جلد از جلد رپورٹ ارسال کریں۔ تحریک بہت طویل ہوتی جا رہی تھی اس لئے انجمن پولیٹکل ایجنٹ کے پاس پہنچ گئی اور اس کے حکم پر ماناوَدر کے دربار اور دوسروں نے ایک عدالت تشکیل دے کر دونوں فریقوں کی سماعت کرنے کا اعلان کر دیا۔

دونوں فریقوں کو اپنے اپنے وکیل لانے کی اجازت تھی۔ چنانچہ جماعت کی طرف سے کالی داس اور انجمن کی جانب سے عثمان بھائی وکیل کے طور پر پیش ہوئے۔ میں بھی وہاں گیا تھا۔ اس موقع پر سیٹھ صاحبان اور انجمن کے

عہدہ دار بھی موجود تھے۔مجموع درباروں کی اس عدالت میں دونوں جانب سے آمنے سامنے دلائل ہوئے۔

انجمن کی طرف سے قرآن کے حوالے سے دلائل دیئے گئے اور کہا گیا کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں پر محمڈن لاء لاگو ہوتا ہے تو بانٹوا کے میمنوں پر کیوں لاگو نہیں کیا جاتا؟ مخالف فریق نے دلیل پیش کی کہ قرآن کسی پر بھی جبراً کوئی قانون نہیں تھوپتا۔اللہ عزوجل کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والا خود اللہ عزوجل کا گناہگار ہوگا۔

میں اس وقت کم سن تھا اور اپنے چچا اور انجمن کے ایک نمائندے کے ساتھ وہاں گیا تھا۔بہرحال دونوں فریقوں کے دلائل سننے کے بعد دربار صاحبان نے بانٹوا پر محمڈن لاء لاگو کر دیا۔اس مقدمے کی کاروائی میں مانا وَدر کے نواب صاحب نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔عدالت کے فیصلہ کے بعد بانٹوا میں تقسیم ورثہ پر بھی محمڈن لاء نافذ کر دیا گیا۔

بانٹوا میں مانا وَدر جانے والی سڑک پر ایک پرانا قبرستان تھا۔بانٹوا کے درباروں نے یہ قبرستان حسین سیٹھ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا تو بانٹوا کے عوام میں اس فیصلے کی زبردست مخالفت ہوئی۔قبرستان کی فروخت کے خلاف عوامی تحریک کی قیادت بھی بانٹوا انجمن نے ہی سنبھال لی تھی۔

اس سلسلے میں انجمن کے عہدہ داروں نے بانٹوا کے درباروں اور پولیٹکل ایجنٹ سے بھی ملاقات کی اور انہیں سمجھایا کہ ایک مسلم ریاست قبرستان فروخت نہیں کر سکتی۔انجمن کی طرف سے حسین سیٹھ کو بھی سمجھایا گیا کہ ایسا کرنے سے بانٹوا کے لوگوں میں اشتعال پیدا ہوگا۔آدم سیٹھ نے بھی اس سودے کی مخالفت کی اور حسین سیٹھ مان گئے۔

درباروں کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اور یوں قبرستان کی فروخت کا سودا کینسل ہوگیا۔بعد میں انجمن نے قبرستان کے اطراف خاردار باڑھ باندھی اور قبرستان کو مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لیا۔قبرستان والی سڑک پر داؤد موتی والا کے ورثاء نے درخت لگائے۔یوں قبرستان کو فروخت ہونے سے بچانے میں انجمن کو مکمل کامیابی حاصل ہوئی اور بانٹوا میں فساد کا خطرہ ٹل گیا۔بانٹوا کے میمن مذہب کے معاملے میں بہت سخت تھے اور مذہب کے خلاف یا خلاف شریعت کوئی کام برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

بعد میں تو بانٹوا جماعت خود انجمن کی مخالف ہوگئی تھی۔قربانی کھالیں پہلے بانٹوا جماعت جمع کرتی تھی۔پھر یہ کام انجمن کے حوالے کر دیا گیا تھا۔جماعت نے یہ کام پھر اپنی تحویل میں لے لیا اور جماعت خود کھالیں جمع کرنے

لگی۔البتہ انجمن نے زنانہ دواخانہ اور قبرستان کا انتظام آخر یعنی 1947ء تک سنبھالے رکھا۔

دونوں اداروں میں اسی مقابلے کی وجہ سے یا پھر کسی نیک مقصد سے صالح محمد حسین دادا نے ایک ڈسپنسری کھولی جس کے لئے راجکوٹ سے ایک انگریز لیڈی ڈاکٹر کو طلب کر کے ڈسپنسری میں اس کا تقرر کیا گیا۔لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ ایک انگریز ڈاکٹر بھی آیا۔وہ دونوں اچھے انسان تھے اور دونوں ہمارے مکان میں بطور کرایہ دار رہتے تھے۔ ان کے بعد مسلمان ڈاکٹر بھی اس ڈسپنسری میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ بانٹوا میں اتنے سارے دولت مند اور امیر الامراء ہونے کے باوجود علاج معالجہ اور آپریشن کا کوئی بندوبست نہ تھا اور لوگوں کو علاج کے لئے جوناگڑھ یا راجکوٹ جانا پڑتا تھا۔

بانٹوا میں قوم پرستی یا فرقہ واریت نہ تھی۔حالانکہ زیادہ تر ڈاکٹر،منصف،فوجدار وغیرہ ہندو تھے۔1940ء کے بعد بانٹوا میں مسلمان ڈاکٹر،منصف اور فوجدار آنے لگے۔ایسا ہونا ضروری بھی تھا اور اس کے لئے بانٹوا انجمن حمایت اسلام ہمیشہ سرگرم عمل رہی۔1947ء تک اس انجمن نے بانٹوا میں عمدہ قومی خدمات سرانجام دیں اور تقریباً ہر معاملہ میں سرخرو ہوئی۔

عکسِ بانٹوا

☞ ☞ ☞

پاکستان کے ساتھ الحاق اور سقوط جوناگڑھ

1947ء میں تحریک پاکستان کامیابی سے سرفراز ہوئی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مسلمان کی طرح بانٹوا کے جوانوں نے بھی تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیا۔ بانٹوا اور ماناوَدر کو پاکستان میں شامل کرنے کے لئے کافی سرگرمیاں کی گئیں جس کے نتیجے میں جوناگڑھ کے ساتھ ماناوَدر، سردارگڑھ اور بانٹوا تعلقہ بھی پاکستان میں شامل ہوا۔

بانٹوا کے مجموع درباروں نے بھی اپنے جوڈیشل رائٹس جوناگڑھ کے پاس ہونے کے سبب پاکستان کے ساتھ ہونے والے اختلاط کو منظور کرلیا تھا۔ لیکن ستمبر 1947ء میں بھارت نے سردارگڑھ پر زبردستی قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ماناوَدر پر بھی قبضہ کرلیا گیا اور ماناوَدر کے دربار کو راجکوٹ لے جایا گیا۔

اس طرح بانٹوا تعلقہ کے دربار شیر خانجی کو بھی راجکوٹ لے جایا گیا اور وہاں ان دونوں درباروں سے زبردستی دستخط کرانے کے بعد انہیں رہا کردیا گیا۔ جب بھارت نے بانٹوا پر قبضہ کیا تو اس وقت بانٹوا میں صرف ایک منیجر ہی موجود تھا۔ اس وقت سردارگڑھ کے دربار جوناگڑھ میں تھے اس لئے وہ محفوظ رہے۔

ریاست جوناگڑھ نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا تھا مگر بھارت کو منظور نہ تھا۔ چنانچہ کانگریسی حکومت نے جوناگڑھ پر جارحیت کے ذریعے قبضہ کرنے کے منصوبے تیار کئے۔ شامڑداس گاندھی کی سیاسی شورش کو بنیاد بنا کر اس کی عارضی حکومت کا ڈھونگ رچایا گیا۔ یہ سوال مورخین کے لئے غور طلب ہے کہ شامڑداس گاندھی کے پاس تو بیڑی کا پیکٹ خریدنے کے لئے بھی پیسے نہ تھے۔ پھر اتنی بڑی فوج کو جوناگڑھ تک پہنچانے کے لئے اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی تھی۔

مانگرول پر بھارتی فوج نے قبضہ کرلیا تو جوناگڑھ چاروں سمت سے بھارت کے نرغے میں آگیا۔

جوناگڑھ کے لئے باہر سے مال سامان بھی مانگرول کی بندرگاہ کے ذریعے آتا تھا۔مگر اب یہ راستہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

جام نگر کے مہاراجہ کی جوناگڑھ کے نواب سے گہری دوستی تھی۔وہ جوناگڑھ کے نواب کو ان کا (پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ) فیصلہ تبدیل کرنے کے لئے سمجھانے کے مقصد سے جوناگڑھ پہنچے۔مہاراجہ نے یہ منصوبہ پیش کیا کہ کاٹھیاواڑ کی تمام ریاستوں کا ایک گروہ بنایا جائے جس کے صدر نواب صاحب ہوں۔لیکن جوناگڑھ کے نواب صاحب نے اس منصوبے کے منظور نہ کیا۔

جب نواب صاحب پر دباؤ بہت بڑھ گیا تو وہ سلطنت جوناگڑھ چھوڑ کر کراچی چلے آئے۔ان کے پیچھے ان کے دیوان سر شاہنواز بھٹو (مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے والد) بھی کراچی پہنچ گئے جبکہ صرف ایک انگریز نائب دیوان جوناگڑھ میں رہ گئے۔

انگریز نائب دیوان آف جوناگڑھ نے مسلمانوں کے نمائندوں کو اپنے پاس طلب کیا جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔اس وقت میں ویراول ٹمبر مرچنٹ کا سیکریٹری تھا۔ویراول کے نمائندے جاڈن، مرلیٰ، اڑانا وغیرہ تھے۔نائب دیوان نے ہم سے کہا کہ بھارت کی ہر جگہ موجود رہنے والی فوجوں کے ساتھ لڑنے کی طاقت ہم میں نہیں اور پاکستان اپنی فوج یہاں نہیں بھیج سکتا۔ایسے حالات میں ہمارے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ایک تو یہ کہ عوام کا قتل عام ہونے دیا جائے۔دوسرا یہ کہ بھارت کی فوج کو جوناگڑھ کا قبضہ دے دیا جائے۔

ویراول کے نمائندے نے سوال کیا کہ نواب صاحب کی مرضی کیا ہے؟ دیوان نے جواب دیا کہ وہ قتل عام کے خلاف اور ریاست بھارت کے حوالے کر دینے کے حامی ہیں۔یہ سن کر میٹنگ میں موجود تمام مسلمان نمائندے پریشان اور مایوس ہو گئے اس کے بعد جو کچھ ہونے کا خطرہ تھا وہی سب کچھ ہوا۔

16 اکتوبر 1947ء کو انگریز نائب دیوان راجکوٹ گئے اور اس بیان پر دستخط کر دیئے کہ بھارتی حکومت ریاست جوناگڑھ کا قبضہ سنبھال لے۔چنانچہ دو دن بعد یعنی 18 اکتوبر کو جوناگڑھ میں اور 19 اکتوبر کو ویراول میں بھارتی فوج نے داخل ہو کر دونوں شہروں پر قبضہ کر لیا۔فوج کے ساتھ شامڑ داس گاندھی اور رولھ بھائی پٹیل بھی آئے اور انہوں نے سومنات کے مندر کو پھر زندہ کرنے کا اعلان کیا۔

جوناگڑھ اور ویراول پر بھارتی قبضے کے بعد بانٹوا بگسرا، کتیانہ اور جوناگڑھ میں لوٹ مار کا عمل شروع ہوا۔

بانٹوا میں آبادی کی اکثریت تو میمن تاجروں کی ہی تھی جن میں اکثر مرد ملازمت وتجارت کے سلسلے میں بیرون ملک رہتے تھے اس لئے دراندازوں اور شرپسندوں کو من مانی کرنے کا موقع مل گیا۔اگر چہ بھارتی فوج ٹینکوں اور توپوں کے ساتھ وہاں موجود تھی مگر دراندازوں کو روکنے کی کسی نے کوشش نہ کی۔

چنانچہ دل کھول کر بانٹوا کے شہریوں کو لوٹا گیا، بنکوں میں بھی لوٹ مار ہوئی۔لٹیروں نے حبیب بینک کو لوٹنے کی کوشش کی تو بینک کے چوکیدار نے گولی چلا کر ایک لوٹنے والے کو ہلاک کر ڈالا۔اس لئے شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔اس طرح شہریوں کو ان کے گھروں میں بند رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔یہ تماشا دو دن جاری رہا۔

حکمرانوں پر رعایا کو اعتماد نہیں رہا تھا۔چنانچہ بانٹوا کے مسلمانوں نے اجتماعی طور پر ہجرت کا آغاز کر دیا۔ بانٹوا مجموع دربار کے منیجر نے آدم سیٹھ، حسین سیٹھ اور سید محمد علی کو طلب کر کے کہا۔

''ہجرت بند کرائی جائے، ہم آپ کو حفاظت کا یقین دلاتے ہیں۔آئندہ کچھ نہیں ہوگا۔''

جہاں حفاظت کرنے والے ہی تشدد اور لوٹ مار کرنے لگیں، وہاں اعتماد کی فضا کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔ اس لئے وہ ہجرت کرنے والوں کو نہ روک سکے۔

ہجرت کرنے والے سہ پہر کے وقت میرے دادا قاسم لوائی کی دکان پر آتے اور سات بجے روانہ ہونے والی ٹرین میں سوار ہو جاتے۔اس طرح دس پندرہ دن میں ہی بانٹوا خالی ہو گیا۔آگ وخون، لوٹ مار، دہشت گردی اور زخمیوں کی چیخ وپکار کے دوران تو نقارے بجانے والے خبیث ہی قیام کر سکتے ہیں۔انسان کو تو ایسی جگہ چھوڑنی ہی پڑتی ہے۔چنانچہ بانٹوا کا تاجر طبقہ ہجرت کر گیا۔ ہمارے خاندان کے افراد بھی ہجرت کر گئے۔صرف میرے والدین، دادا لطیف سیٹھ اور چند دوسرے لوگ باقی رہ گئے۔

جو لوگ اپنا مال واسباب چھوڑ کر بانٹوا سے چلے گئے تھے، بعد میں وہ واپس آنے لگے تا کہ اپنا مال واسباب اپنے ساتھ لے جا سکیں۔قاسم لوائی کی ٹمبر مارکیٹ میں روزانہ سو سے سوا سو افراد قیام کرتے۔عورتوں کے رہنے کے لئے بھی مکان میں سہولت موجود تھی۔زیادہ تر لوگ اپنا سامان فروخت کر دیتے یا سامان کے ساتھ بانٹوا سے ہجرت کر جاتے۔یہ سلسلہ تین ماہ تک جاری رہا۔

حاجی قاسم لوائی کی ٹمبر مارکیٹ بانٹوا والوں کے لئے ایک بڑی ''راحت چھاؤنی'' ثابت ہوئی۔کیونکہ اول

تو وہاں سے اسٹیشن قریب تھا۔دوسرا وہاں مسلمان خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔قاسم لوائی بانٹوا کے سومنات اور رام مندر کے کچھ عرصے تک خازن بھی رہے تھے۔اسی طرح بانٹوا کے منصف (جج) شیوشنکر کے فرزند اور ہمارے خاندان کے بزرگ اس وقت کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ہمارے دادا قاسم لوائی اور والد کے تعلقات ان کے علاوہ بانٹوا مجموع دربار کے منیجر کے ساتھ بھی بہت اچھے تھے۔چنانچہ اس وقت ہمارے مطالبہ کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے ہماری حفاظت کے لئے دو تین یونیفارم والے پولیس مین بھی مہیا کر دیے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ میرے والد حاجی ولی محمد لوائی اور دادا قاسم لوائی اکیلے ہی بانٹوا میں رہ گئے۔اس وقت میں ویراول میں تھا اور بانٹوا آتا جاتا رہتا تھا۔میرے والد نے ٹمبر مارکیٹ فروخت کر دی اور ہجرت کر کے کراچی چلے گئے۔لیکن میرے دادا قاسم لوائی کسی طرح بھی بانٹوا سے جانے پر تیار نہ تھے۔بانٹوا چھوڑنے کی بات ہوتے ہی وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتے اور کہتے کہ چاہے مجھے مار ڈالیں میں بانٹوا نہیں چھوڑوں گا۔میں تو بانٹوا میں ہی مرنا چاہتا ہوں اور اپنے باپ دادا کے قبرستان میں ہی دفن ہونا چاہتا ہوں۔

چنانچہ انہیں بانٹوا میں ہی رہنے دیا گیا۔ان کے ساتھ ایک باورچی اور دو تین دوسرے آدمی تھے۔بانٹوا کی مساجد کے ایک دو پیش امام بھی ان کے ساتھ تھے۔اس وقت بہت کم افراد بانٹوا آتے جاتے تھے،انہیں باورچی کھانا پکا کر کھلاتا تھا۔میں نے ویراول کی ٹمبر مارکیٹ میں کاروبار جاری رکھا۔ہفتے میں ایک دو روز بانٹوا جا کر قیام کرتا۔

☞ ☞ ☞

ویراول کی بندرگاہ

میں ویراول میں ٹمبر مرچنٹ کا سیکریٹری تھا۔اس لئے مجھے ہر لحاظ سے وہاں اطمینان حاصل تھا۔البتہ مجھے وہاں ایک ناپسندیدہ کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ہوا یوں کہ شامڑ داس گاندھی جس کی مسلمان دشمنی سب پر عیاں تھی، ویراول آیا تو ٹمبر مرچنٹ کے صدر کومن داس نانجی نے مجھے کہا کہ میں شامڑ داس کے گلے میں ہار نہیں ڈالوں گا،میری جگہ آپ پہنایئے گا۔مجھے شامڑ داس سے شدید نفرت تھی اس لئے میں نے انکار کر دیا۔لیکن کومن داس نانجی نے اصرار کر کے مجھے اس ناپسندیدہ کام کے لئے زبردستی راضی کیا۔مجبوراً مجھے بطور سیکریٹری ٹمبر مرچنٹ یہ فرض بجالانا پڑا۔

اسی طرح بانٹوا میں بھارت کے قومی پرچم کی سلامی میں ہمارے چچا حاجی عمر لوائی کو زبردستی حاضر رہنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔یہ سلامی بانٹوا کے عوام کی مرضی کے خلاف بانٹوا مجموع کے منیجر کے طلب کردہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک مشترکہ جلسہ میں دی گئی تھی۔ہمارے چچا اس وقت بانٹوا جماعت کے سیکریٹری تھے اس لئے انہیں بھی جلسہ میں حاضر رہنے کے لئے زبردستی کی گئی۔

ویراول بندرگاہ تھی اور وہاں سے کراچی کے لئے اسٹیمر چلتی تھی۔اس لئے سمندری راستے سے کراچی جانے والے لوگوں کا وہاں اچھا خاصا رش رہتا تھا۔اردگرد کے گاؤں سے ہجرت کر کے کراچی جانے کے لئے ویراول آنے والے مہاجروں کے طعام وقیام کا انتظام مقامی انتظامیہ کو کرنا پڑتا اور اس کے لئے ویراول کے عوام اچھا خاصا تعاون کرتے تھے۔تھوڑے عرصہ بعد ہم دادا جان کو سمجھا بجھا کر بانٹوا سے ویراول لے آئے اور ان سے کہا کہ ہمیں اپنے خاندان سے جدا ہوئے پندرہ مہینے ہو گئے ہیں،چلیں کراچی جا کر سب سے مل آئیں۔پھر ہم جام نگر سے براستہ ہوائی جہاز کراچی آئے۔

میرے والدین اور بیوی بچے سب کراچی میں تھے۔مجھ پر بھی ان کی جانب سے دباؤ بڑھنے لگا کہ میں بھی

اب دکان بیچ کر مستقل کراچی آجاؤں، اللہ عزوجل مالک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔اس لئے ہمیں ویراول کی دکان بند کرنا پڑی۔میں نے نومبر 1948ء میں ایک ہندو سے مل کر ویراول میں "نگین داس" نامی کمپنی ترتیب دی اور تمام کام کاج اس کے سپرد کر کے کراچی چلا آیا۔لیکن وہ ہندو میرے روپے کھا گیا۔بانٹوا کی ہماری ٹمبر مارکیٹ کی بھی ہمیں بمشکل دس پندرہ فیصد رقم ہی حاصل ہوئی تھی۔

بانٹوا میں بانٹوا جماعت کے پاس طلاق وفیصلے کے لئے طلائی زیورات اور نقد رقوم کی صورت میں چند امانتیں رہتی تھیں جن کی حفاظت کا کام ایک ہندو گماشتہ کرتا تھا۔ہجرت کے بعد جب کراچی میں بانٹوا جماعت کا قیام عمل میں آگیا تو بانٹوا سے تمام امانتیں جماعت نے کراچی منگوا کر ان کے مالکان کے حوالے کردیں۔

عکسِ بانٹوا

کراچی میں بانٹوا جماعت کا قیام

کراچی ہجرت کر کے آنے والے میمنوں نے اپنی بانٹوا والی جماعتی سرگرمیاں شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور جلد ہی بانٹوا جماعت بنالی۔ کراچی میں تشکیل پانے والی نئی بانٹوا جماعت کے پہلے منیجر جناب عثمان دھامیا تھے۔ جبکہ صدر حسین سیٹھ، نائب صدر آدم سیٹھ اور سیکریٹری جناب حاجی عمر بندھانی تھے۔ اس جماعت کا اولین دفتر پاکستان فلور ملز میں تھا۔ میں اُن دنوں کراچی میں شاذ و نادر ہی رہتا تھا۔ لیکن جماعت کی کاروائیوں کے بارے میں باخبر رہتا تھا اور میرے سننے کے مطابق جماعت کا کام کاج اچھا چلتا تھا۔ اس وقت خاندانی جھگڑے اور طلاق وغیرہ کے معاملات نمٹائے جاتے تھے۔

بانٹوا جماعت کی تشکیل کے کچھ عرصے بعد اس کا آئین منظور کیا گیا۔ اس آئین کے مطابق جماعت کے تین صدر منتخب کئے جاتے مگر بعد میں ان کی تعداد سات کر دی گئی۔ کمیٹی کے ارکان کا انتخاب یہ سات صدور ہی کرتے تھے۔ 1961ء تک تو یہی دستور عمل رہا۔ اس کے بعد بانٹوا جماعت کے اراکین اس دستور کے خلاف ہو گئے اور تقریباً تین سو دستخطوں سے جماعت کو ارسال کئے جانے والے ریکوزیشن کے ذریعے انہوں نے جماعت کے عہدہ داروں کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کر دیا۔

1۔ سات صدور پر اختلاف

اس ریکوزیشن کے لئے جماعت کے اراکین کی میٹنگ کلاتھ مارکیٹ میں ہوئی تھی۔ اچھی خاصی تعداد میں حاضرین موجود تھے۔ کچھ لوگوں نے ستار ایدھی کو ساتھ ملایا تھا۔ متعدد نوجوان بھی میٹنگ میں آ گئے تھے۔ اس طرح وہاں کشیدگی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ جان محمد داؤد جو کہ سات صدور میں سے ایک تھے، انہوں نے میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ سات صدور والا دستور العمل برابر جاری ہے اور قوم بھی اس دستور العمل کے خلاف نہیں۔

اس کے فوراً بعد میٹنگ برخواست کر دی گئی ورنہ ہنگامہ ہونے کا اندیشہ تھا۔ ہمارے گروپ نے بھی ماحول کی کشیدگی کے پیش نظر کوئی خاص دباؤ نہیں ڈالا تھا۔

ہمارے گروپ لیڈر جناب سلیمان بھورا تھے۔ جب جماعت کی طرف سے سات صدور کی امیدواری کے کاغذات نامزدگی طلب کئے گئے تو ہم نے تمام سیٹھوں سے ملاقات کر کے انہیں کاغذات داخل نہ کرنے کے لئے سمجھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ہم کامیاب رہے۔ چنانچہ کسی سیٹھ نے بھی کاغذات نامزدگی جمع نہ کرائے۔ ہمارے سمجھانے اور فضا کو دیکھتے ہوئے جان محمد داؤد اور محمد عبداللہ نے بھی اپنی نامزدگی کے کاغذات داخل نہ کرائے۔ انہوں نے جنرل باڈی سے ہی اراکین لے کر وہیں پر صدور کے انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا۔

2۔ جنرل باڈی کا اجلاس

جنرل باڈی کا اجلاس ایرانیان ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اتنا رش ہو گیا کہ ہال میں کھڑے رہنے کی بھی جگہ نہ رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ افراد کو جنرل باڈی کے اجلاس میں شریک کرنے کے لئے کوشش کی تھی۔ ہمارے اپنے آدمی بھی بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ ہمارا کام یہ باور کرانا تھا کہ سات صدور کے دستور العمل کی کوئی بھی شخص حمایت و معاونت نہیں کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ ہم کلاتھ مارکیٹ والی میٹنگ میں گڑبڑ اور شور شرابا کرنے والے نوجوانوں کے خلاف بھی مورچہ بندی کرنا چاہتے تھے۔ یہ کام بھائی اے ستار بلوانی اور ان کے چند ساتھیوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ جبکہ میرے سپرد کئے گئے کام کے مطابق اسکول کے درجہ نہم کے لڑکوں کو جلسہ میں لا کر مختلف جگہوں پر اس طرح متعین کرنا تھا کہ اگر کوئی سات صدور والے دستور العمل کی حمایت میں بولے تو وہ لڑکے فوراً شور برپا کر دیں۔

پھر جلسہ کی کاروائی کا آغاز ہوا۔ جماعت کے متعلقہ ایجنڈے کے بعد جان محمد بھائی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کسی امیدوار کے کاغذات نامزدگی موصول نہیں ہوئے اس لئے جلسہ سے نام ارسال کئے جائیں۔ مگر یہ بات سنتے ہی جلسہ میں گڑبڑ شروع ہو گئی۔ سب بیک آواز کہنے لگے کہ ہم موجود دستور العمل کی مخالفت کرتے ہیں۔ جان محمد بھائی نے اپنی تقریر بند کر دی اور جناب سلیمان بھورا جلسہ سے واک آؤٹ کر گئے۔ اس کے بعد احمد داؤد اسٹیج

پر آئے اور انہوں نے کہا کہ جلسہ برخاست کر دیا جائے۔اس پر پھر شور برپا ہوا کہ فیصلہ اسی جلسے میں ہوگا۔

3۔میمنی میں بولو

اس کے بعد حاجی رحمت اللہ غنی جانگڑا نے ایک تجویز پیش کی کہ ایک ایڈہاک کمیٹی تشکیل دی جائے اور نیا آئین مرتب کیا جائے۔اس وقت تک ایڈہاک کمیٹی جماعت کے انتظامات چلائے۔میں نے اس تجویز کی حمایت اور تائید کی۔اس موقع پر ایک دلچسپ صورت حال پیدا ہوگئی۔وہ یہ کہ میں نے اردو میں تقریر شروع کر دی تھی۔اس پر جلسہ سے شور بلند ہوا کہ میمنی زبان میں بولو۔میمنی میں بولو۔چنانچہ میں نے اردو کی بجائے میمنی زبان میں حاجی رحمت اللہ غنی جانگڑا کی تجویز کی تائید وحمایت میں تقریر کی۔

اس کے بعد جان محمد بھائی نے منصب صدارت کے متعلق جلسہ کی رائے معلوم کرنے کے لئے حاضرین جلسہ سے دریافت کیا تو سب نے تجویز کی تائید کر دی۔صرف پانچ سات جوان ہی مخالفت کرتے رہے لیکن ان کی بات پر کسی نے توجہ نہ دی اور نہ ہی انہیں بولنے کا موقع دیا گیا۔

ایڈہاک کمیٹی قائم کرنے کی تجویز منظور ہونے کے بعد ایڈہاک کمیٹی کے لئے نام پیش کئے گئے اور ان ناموں کی منظوری کے بعد جنرل باڈی کا یہ جلسہ خیریت سے برخاست ہوگیا۔ہمارے گروپ نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ جلسہ میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ہم نے اسکول کے لڑکوں کو اس طرح بٹھایا تھا کہ کوئی گرما گرمی ہو جائے تو اسے فوراً روکا جا سکے کیونکہ دوسرے فریق نے بھی چند لڑکوں کو وہاں بلایا ہوا تھا۔

4۔نیا آئین اور کمیٹی کا الیکشن

نیا آئین کیسا ہونا چاہئے؟اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ایڈہاک کمیٹی نے مختلف لوگوں سے ملاقات کی۔میری اپنی رائے یہ تھی کہ 50 افراد منتخب کئے جائیں جو صدر اور سیکریٹری کو منتخب کریں۔لیکن ایڈہاک کمیٹی نے میری رائے سے اتفاق نہ کیا۔بالآخر گیارہ اراکین کی مجلس منتظمہ تشکیل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔اس مجلس منتظمہ میں میں شامل نہ تھا۔

مجلس منتظمہ نے آئین کی تشکیل کر کے اس کی منظوری کے لئے جلسے کا اہتمام کیا۔اس جلسہ میں اچھی

خاصی تعداد میں حاضرین موجود تھے۔آئین منظور کرلیا گیا۔اس کے بعد گیارہ افراد کے انتخاب کے لئے کاغذات نامزدگی طلب کئے گئے۔جواب میں اٹھارہ بیس کاغذات نامزدگی داخل کئے گئے۔الیکشن کمیٹی نے انتخابات بذریعہ بیلٹ کرائے۔مدرسۂ اسلامیہ کی عمارت میں ووٹنگ سنٹر قائم کیا گیا۔

بھائیوں نے مجھ سے بھی کاغذات نامزدگی داخل کرائے تھے اور میں الیکشن میں دوسرے نمبر پر کامیاب ہوا۔آئین کے مطابق ان منتخب گیارہ ارکان نے صدر کا انتخاب کرنا تھا وہ بھی ہوگیا۔ایڈہاک کمیٹی کو سب سے پہلے سپریم باڈی کے انتخابات کرانا تھے اور سپریم باڈی چند اراکین کا انتخاب کرنے والی تھی۔یہ سارے مراحل بھی بخیر وخوبی انجام کو پہنچے۔

اس کے بعد وجود میں آنے والی 50 اراکین پر مشتمل باڈی کو سینئر اور جونیئر صدور اور سیکریٹری و جائنٹ سیکریٹری وغیرہ کا انتخاب کرنا تھا۔سیکریٹری ایسا ہونا چاہئے جو سب کام برابر کرسکے۔بھائی ستار بلوانی سے یہ عہدہ قبول کرنے کے لئے بے حد اصرار کیا گیا۔لیکن وہ رضامند نہ ہوئے۔اس لئے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے۔لیکن میں نے بھی انکار کردیا۔اس کے بعد انہوں نے جناب سلیمان بھورا سے رابطہ قائم کیا کہ وہ مجھے اس بارے میں تیار کریں۔میں سلیمان بھائی کو اپنا مربی اور سرپرست سمجھتا ہوں اور ان کی بات نہیں ٹالتا۔

اس وقت میں انجمن کا سیکریٹری بھی تھا اور میمن ایجوکیشن بورڈ کا جائنٹ سیکریٹری بھی،لیکن جناب سلیمان بھورا کے کہنے پر میں نے جماعت کے اعزازی سیکریٹری کی ذمہ داری بھی قبول کرلی۔

عہدہ داروں کے انتخابات کرانے کا اہتمام جماعت کے دفتر میں کیا گیا۔سینئر اور جونیئر صدر کے انتخابات کے بعد سیکریٹری کے منصب کے لئے میرا نام پیش کیا گیا اور میں اکثریت کی رائے سے جماعت کا سیکریٹری منتخب ہو گیا۔جائنٹ سیکریٹری تھرڈ سیکریٹری کے لئے ووٹنگ ہوئی اور بھائی ستار بلوانی جائنٹ سیکریٹری منتخب ہو گئے۔الیکشن کے بعد جماعت کے سارے انتظام وانصرام کا بار میرے کندھوں پر آپڑا۔

اس وقت تک میں جماعت کی سرگرمیوں اور اس کے امور کے طریقۂ کار سے واقف نہ تھا۔1961ء کے بعد میں نے جماعت میں کبھی سرگرمی سے حصہ نہیں لیا تھا۔اس لئے اس کے سارے طریقۂ نظام اور جماعت کو درپیش مسائل سے واقف ہونے کے لئے میں روزانہ رات کو تین چار گھنٹے جماعت میں جا کر بیٹھنے لگا۔اس وقت جماعت

میں بطور پیڈ منیجر (Paid Manager) کام کرنے والے عزیز بھائی نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ وہ ایک دانش منداور شریف، جذباتی انسان تھے۔انہوں نے ہی مجھے جماعت کے سارے نظام سے واقف کرایا تھا۔

عکسِ بانٹوا

بانٹوا جماعت کی سماجی سرگرمیاں

1۔ بانٹوا جماعت کی مالی پوزیشن

بانٹوا جماعت کے سیکریٹری کی حیثیت سے میں نے اپنے فرائض انجام دینا شروع کئے۔ حساب کتاب دیکھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ جماعت مقروض ہے۔ میمن کوآپریٹیو بینک سے حاصل کئے گئے Loan کے علاوہ فریقوں سے لئے جانے والے روپے بھی جماعت کے اخراجات کی مد میں خرچ ہو چکے تھے۔ کمیٹی کے پاس آدمجی کاٹن ملز کے چند شیئرز تھے۔ حاجی عمر بندھانی شیئرز ٹرانسفر کرنے کے لئے دستخط نہیں کرتے تھے۔ لیکن میرے کہنے پر انہوں نے دستخط کر دیے۔

اس کے بعد میں نے فنانس کمیٹی کا اجلاس طلب کیا اور اس میں تفصیل سے سارا احوال بیان کیا۔ اجلاس میں آدمجی کاٹن ملز کے شیئرز فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ جماعت کے اخراجات کے لئے کسی سے ہزار، دو ہزار اور کسی سے پانچ سو روپے لینے کا فیصلہ ہوا۔ ان لوگوں سے تو پیسے مل گئے لیکن جناب احمد داؤد نے کچھ بھی نہ دیا۔ بہر حال اس طرح پندرہ بیس ہزار روپے سالانہ وصول ہونے کی امید ہو گئی۔ شیئرز فروخت ہونے سے بھی رقم ملی جس سے جماعت کا قرض ادا کر دیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جماعت کی مالی حالت روز بروز اچھی ہوتی گئی اور اقتصادی طور پر جماعت اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی چلی گئی۔

2۔ جماعت خانے کی تعمیر

جماعت کی مالی حالت درست ہونے کے بعد میں نے پہلا کام جماعت خانے کی تعمیر کے لئے کیا۔ اس کے لئے میں نے فنڈز اکٹھے کئے۔ جماعت خانے کے لئے میں نے پہلے ہی زمین خرید لی۔ اس میں چند کرایہ دار تھے۔ مجھے یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ ان کرایہ داروں کا کیا کیا جائے اور ان سے جگہ کیسے خالی کرائی جائے؟ میں نے جماعت کی مینجنگ کمیٹی میں تجویز پیش کی کہ کوئی صاحب مال جماعت خانہ تعمیر کرا دے، اس کے لئے کوشش کرنی

چاہیے۔

مجلس منتظمہ نے میرے کہنے پر ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے بانٹوا کے صاحب دولت سخی داتاؤں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ دادا، آدم، حبیب اور داؤد، ان چار سیٹھوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مگر تمام سیٹھوں نے مخصوص شرائط پیش کیں۔ ان میں سب سے زیادہ مخیّر انہ اور کریم النفسی پر مبنی شرائط سیٹھ صدیق حاجی آدم کی تھیں جن کے مطابق کرایہ داروں کو جگہ خالی کرانے کے لئے جماعت کی طرف سے دی گئی پگڑی کی رقم وہ جماعت کو دیں گے۔ جگہ خالی کرانے کے لئے اگر مزید پیسہ بھی دینا پڑا تو وہ دیں گے۔ اس طرح جماعت کی صرف قیمت خرید کی حد تک ہی رقم رکے گی جو تقریباً ایک لاکھ روپے بنتی تھی۔

دوسری شرائط یہ تھیں کہ جماعت خانے کے علاوہ آدم میموریل ہال اور اس سے منسلک حاجیانی گرلز اسکول کے دس سال کے کرایہ کے عوض انہیں نام عطا کیا جائے۔ جماعت خانے کی آمدنی جماعت اپنے پاس رکھے اور ملکیت بھی جماعت کی ہی رہے۔ جماعت خانہ اور اسکول کی تعمیر سیکریٹری (یعنی میری اپنی) اور دوسرے دو اراکین کی زیر نگرانی کرائی جائے۔

کمیٹی نے یہ شرائط منظور کرلیں اور انہی کے مطابق ایگریمنٹ کیا گیا۔ اس ایگریمنٹ پر جماعت کی طرف سے میں نے اور جماعت کے صدر قاسم دادا نے دستخط کئے۔

سیٹھ صدیق حاجی آدم نے مجھ سے ایک اور شرط بھی قبول کروائی تھی کہ جب تک جماعت خانے اور اسکول کے سنگ بنیاد رکھنے کی رسم اور ان کے افتتاح کی رسم نہ ادا کر دی جائے اس وقت تک میں ہی جماعت کا سیکریٹری رہوں گا۔ ورنہ وہ ایگریمنٹ پر دستخط نہیں کریں گے۔ دراصل وہ بخوبی جانتے تھے کہ میں نے سیکریٹری کی ذمہ داری صرف ایک سال کے لئے ہی قبول کی ہے۔ چنانچہ قوم کے مفاد کے لئے مجھے ان کی یہ محبت سے بھرپور شرط قبول کرنی پڑی۔

اس ایگریمنٹ کے فوراً بعد کام شروع کر دیا گیا۔ نقشہ پاس کرا کے کرایہ داروں کو پگڑی کی رقم دے کر جگہ خالی کرائی گئی۔ عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کی رسم کراچی کے کمشنر صاحب کے دست مبارک سے ادا کرائی گئی۔ اس تقریب کی خصوصی فلم بنائی گئی تھی۔

3۔ جماعت خانے کا افتتاح

جماعت خانے کی تعمیر شروع ہوگئی۔ پورے دو سال بعد حور بائی حاجیانی اور ان کی والدہ نے عورتوں کے ایک جلسہ کے ذریعے اس کی رسم افتتاح سرانجام دی تھی اور اس کی بھی فلم بنائی گئی تھی۔ میں نے اس موقع پر افتتاحی خطاب کیا تھا۔ اس کے بعد جماعت خانے کی مجلس منتظمہ تشکیل دی گئی۔ اس طرح جماعت خانہ کے سیکریٹری کے طور پر مجھے تین سال تک خدمات انجام دینا پڑیں۔

بعد میں جماعت کے بے حد اصرار کے باوجود کسی طرح بھی میں نے یہ ذمہ داری قبول ہی نہ کی اور جماعت کے جلسہ میں بھی حاضر نہ ہوا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے اپنے تحریر کردہ خط کے ذریعے جماعت کو عاجزانہ درخواست ارسال کردی کہ برائے مہربانی اب مجھے منتخب نہ کیا جائے، میں اب بطور سیکریٹری کام ہی نہیں کرنا چاہتا۔

جماعت کی مجلس منتظمہ نے بڑے دکھ کے ساتھ میری درخواست قبول کی اور میری خدمات کے متعلق ایک قرارداد منظور کی جس میں بے حد تعریفی و مداحی الفاظ میں میری خدمات کو سراہا گیا تھا۔ اس قسم کی قرارداد آج تک جماعت نے کسی دوسرے کے لئے پاس نہیں کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ جماعت نے مجھے سینئر نائب صدر کے عہدہ کے لئے بھی منتخب کرلیا۔ جماعت کی طرف سے اس کے متعلق مجھے ارسال کئے گئے خط میں تحریر کیا گیا کہ جماعت کی خواہش اور درخواست آپ کو قبول کرنا ہی پڑے گی۔ چنانچہ میں نے نائب صدر کے طور پر تین سال تک جماعت کی خدمات انجام دیں اور اس کے بعد میں ریٹائر ہوگیا۔

جماعت خانہ آج جماعت کو لاکھوں روپے کی آمدنی دے رہا ہے۔ جماعت خانے کے لئے اراضی خریدنے میں جناب محمد عبداللہ نے بے حد تعاون کیا اور جان محمد داؤد نے بھی سرگرم خدمات پیش کیں جن کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔

4۔ بانٹوا ملٹی پرپز سوسائٹی

جماعت کے سیکریٹری کے طور پر میری صرف ایک ہی سرگرمی نہ تھی، دوسری سرگرمیوں کا تذکرہ بھی مختصراً کرتا چلوں۔ سیٹھ احمد داؤد قوم کی اقتصادی نشوونما و ترقی کے سلسلے میں ''ملٹی پرپز سوسائٹی'' قائم کرنے کے لئے بے حد

اصرار کرتے رہتے تھے۔وہ ملاقاتوں اور گفتگو میں اس کا تذکرہ کرتے اور جماعت کو خطوط تحریر کر کے اس موضوع پر تجاویز پیش کرتے رہتے تھے۔لیکن اس کے متعلق جماعت کی پرانی مینجنگ کمیٹی کوئی فیصلہ نہ کر سکی تھی۔

میں نے مینجنگ کمیٹی میں تحریک پیش کر کے اس موضوع (سوسائٹی) کی اہمیت لوگوں کو سمجھائی اور کہا کہ یہ منصوبہ قوم کے لئے بہت ضروری اور مفید ہے۔حصص کی فروخت کے ذریعے سرمایہ اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔چنانچہ میری تحریک منظور کر لی گئی اور اس کے متعلق ضروری امور انجام دینے کا اختیار بھی مجھے ہی دیا گیا۔میں نے دوستوں کے تعاون سے کام شروع کیا اور آخر ''بانٹوا ملٹی پرپز سوسائٹی'' کو رجسٹرڈ کرا لیا گیا۔

ملٹی پرپز سوسائٹی کا چیف پروموٹر (Promoter) یعنی مشترکہ سرمایہ کی شراکتیں بنانے کی ترغیب دینے والا میں ہی تھا۔بھائی محمد صدیق پولانی، صالح محمد کالیا اور میں نے حصص کی فروخت کے لئے کوشش شروع کیں۔ پندرہ ہزار روپے کے حصص تو فروخت ہو گئے۔لیکن اس کے بعد بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔بہر حال میں نے فروخت کی تعداد اڑھائی تین لاکھ تک پہنچا دی۔اس سے حاصل ہونے والی رقوم سے بانٹوا کے باشندوں کو Loan دینا شروع کر دیا گیا۔

آج 17 سال ہو گئے میں ہی اس ملٹی پرپز سوسائٹی کا سیکریٹری ہوں۔آج سوسائٹی کے پاس بھرپور سرمایہ، حصص اور ریزرو فنڈ موجود ہے۔متعدد لوگوں کو روزگار کمانے کے لئے صرف سرمایہ کی ہی پریشانی ہوتی ہے۔انہیں Loan کے طور پر سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے۔میرے ذہن میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو سوسائٹی کے Loan سے کام شروع کر کے امیر ہو گئے ہیں، ایک دو تو کروڑ پتی بھی ہو چکے ہیں۔

اگر چہ یہ کام سودکا ہے پھر بھی ہماری قوم کے لئے مفید ثابت ہوا ہے۔کوئی Loan لینے والا ڈیفالٹر نہیں ہوا ہے۔اگر کوئی ڈیفالٹر ہو جائے تو رقم اس کے ضمانتی سے وصول کی جاتی ہے۔آج تک کوئی خاص رقم رائٹ آف نہیں کی گئی۔یہ سوسائٹی بھی بانٹوا جماعت کا ہی ایک ذیلی ادارہ ہے۔میں کافی عرصہ سے جماعت والوں کو کہہ رہا تھا کہ جماعت کی ذمہ داریوں سے مجھے نجات دی جائے، اب بڑھاپے کے سبب مجھ سے کام نہیں ہو پا رہا۔لیکن وہ مجھے چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔

5۔راحت کمیٹی

بانٹوا جماعت رجسٹرڈ ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے جماعت کے کچھ اراکین نے فلاحی وامدادی سرگرمیاں جاری کرنے کی غرض سے ''راحت کمیٹی'' قائم کی جس میں حاجی عبدالرحمٰن قاسم دادا اور دوسرے حضرات کو شامل کیا گیا۔راحت کمیٹی نے بانٹوا کے باشندوں سے فنڈ اکٹھا کر کے یتیم بچوں اور بیوہ خواتین کو ماہانہ اخراجات دینے کا فیصلہ کیا۔1981ء تک جناب محمد عبداللہ راحت کمیٹی کے سیکریٹری رہے۔انہوں نے بڑی عمدہ خدمات انجام دی تھیں۔حاجی اے رحمٰن قاسم دادا کے بعد حاجی حسین پاریکھ راحت کمیٹی کے صدر بنے۔اب بھائی جان محمد داؤد اس کے صدر اور بھائی صدیق پولانی سیکریٹری ہیں۔آج کل فنڈ بھی اچھا خاصا ہے۔

میں بھی تین چار سال اس کمیٹی کی مجلس منتظمہ میں کام کرتا رہا تھا۔میں سمجھتا ہوں کہ زکوٰۃ کے پیسے فوراً استعمال کر لینے چاہئیں،انہیں جمع رکھنا مناسب نہیں۔جبکہ دوسروں کا خیال ہے کہ کسی وقت فنڈ نہ ملیں تو یہ ریزرو پڑی ہوئی رقم کام آئے،اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے فنڈ اچھا ملتا رہتا ہے،اس لئے زکوٰۃ سے حاصل ہونے والی رقم اگلے سال تک ضرورت مندوں میں بانٹ دینی چاہئے۔

میری رائے ہے کہ اگر چہ زکوٰۃ دینے والے تو جماعت کو رقم دے کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں مگر عہدہ داران گناہگار ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ زکوٰۃ کی رقم سود پر دینا بھی خلاف شریعت ہے۔اس لئے حق داروں کو اچھی خاصی رقم عنایت کر کے ان کے پیروں پر انہیں کھڑا کرنا چاہیے۔لیکن کمیٹی کے دوسرے اراکین میری ان آراء سے متفق نہیں تھے اور وہ اپنے نکتہ نظر سے فنڈ تقسیم کرنا چاہتے تھے۔اس لئے میں راحت کمیٹی کی سرگرمیوں سے الگ ہو گیا۔

میمن قوم کی ترجمانی کے لئے عرصے سے ایک جریدہ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔چنانچہ بانٹوا میمن جماعت نے 'میمن سماج' نامی ایک جریدے کی اشاعت کے لئے سرگرمی شروع کی۔یہ ایک قابل ستائش کاوش اور قابل تعریف قدم تھا۔شروع میں بھائی صدیق پولانی نے سالہا سال تک 'میمن سماج' کے اعزازی مدیر کے طور پر قابل قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔میمن سماج کی جانب سے ہی طلبا کو ارزاں قیمت پر نوٹ بکس فراہم کی جاتی تھیں پھر کچھ اختلاف کے باعث بھائی صدیق پولانی نے 'میمن سماج' کے مدیر کا عہدہ چھوڑ دیا اور اب بھائی غفار کٹیا اس

فرض کوانجام دے رہے ہیں۔

میمن سماج میں تمام میمن اداروں کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیل شائع ہوتی ہے نیز بانٹوا سے تعلق رکھنے والے خاندانوں میں ہونے والی منگنی،شادی بیاہ اور رحلت پانے والوں کے نام بھی شائع کئے جاتے ہیں۔اس طرح بانٹوا سے تعلق رکھنے والے افراد کا مکمل ریکارڈ میمن سماج کے ذریعہ محفوظ ہوگیا ہے۔

☛ ☛ ☛

عکسِ بانٹوا

کراچی میں میمنوں کی آبادکاری

بانٹوا سے ہجرت کر کے کراچی آنے والے میمنوں کو یہاں رہائش کے لئے بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور ہجرت کے بعد دس سالوں میں بھی ان کے رہائشی مسائل حل نہیں ہو سکے تھے۔ بے شمار میمن ابھی تک اپنی ذاتی رہائش گاہوں سے محروم اور کرایہ کے مکانوں میں محدود زندگی گزار رہے تھے۔ ان غریب میمنوں کی آبادکاری کے لئے کراچی کی بانٹوا جماعت اور دیگر جماعتوں، بانٹوا انجمن اور ویلفیئر سوسائٹی نے کافی جدوجہد کی۔

1958ء میں پاکستان میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کو حکومت کی طرف سے 120 مربع گز کے دو ہزار پلاٹ فیڈرل بی ایریا میں دیے گئے۔ سوسائٹی نے تمام جماعتوں کو کھڈا، لیاری کے علاقے میں مقیم اپنے اراکین کا سروے کر کے پلاٹوں کے لئے درکار درخواستیں جمع کرنے کی تجویز پیش کی۔ جناب سلیمان بھورا نے جماعت میں یہ معاملہ اٹھایا۔ اس پر جماعت نے ایک نوآبادی کمیٹی تشکیل دی جس میں سلیمان بھورا، لطیف سیٹھ، محمد عبداللہ، حاجی اے رحمٰن سیٹھ اور راقم الحروف وغیرہ شامل ہوئے۔ کھڈا اور لیاری کے علاقے میں بانٹوا کے 118 خاندان مقیم تھے۔ اس لئے جماعت کی طرف سے 118 پلاٹوں کی درخواستیں سوسائٹی میں داخل کی گئیں۔

لیکن فنڈ کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ بانٹوا جماعت رجسٹرڈ ادارہ نہیں تھا اس لئے اسے فنڈ مہیا کرنے والوں کو انکم ٹیکس میں مذکورہ مد میں رقم واپس حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ لیکن بانٹوا راحت کمیٹی رجسٹرڈ ادارہ ہے اور اس کے فنڈز وعطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے بانٹوا جماعت کی نوآبادی کمیٹی نے یہ کام راحت کمیٹی کے سپرد کر دیا۔

راحت کمیٹی نے ایک ذیلی کمیٹی قائم کر کے اس میں درج بالا کمیٹی کے اراکین کو شامل کیا جس میں سلیمان بھورا، محمد عبداللہ، اور راقم الحروف وغیرہ شامل تھے۔ اس طرح ہم نے نوآبادی کے لئے فنڈ تشکیل دے دیا۔ اس فنڈ کے لئے حاجی اے رحمٰن قاسم نے 50 ہزار روپے عنایت فرمائے۔ دوسرے سیٹھ صاحبان نے بھی پچیس پچیس ہزار روپے کا عطیہ دیا البتہ سیٹھ احمد داؤد نے کچھ نہ دیا۔ بہر حال مجموعی طور پر تین لاکھ روپے کا فنڈ جمع ہوا اور فیڈرل بی ایریا

میں بانٹوا کے باشندوں کے لئے سب سے پہلے 60 مکانات کی بنیاد رکھی گئی۔ایک مکان پر تقریباً چار ہزار روپے خرچ ہوئے۔تعمیر کے بعد پہلے 60 خاندانوں کو رہائش کے لئے ان مکانوں کا قبضہ بھی دے دیا گیا۔

1۔نوآبادی کے قیام میں تکالیف

میمنوں کی نوآبادی کے قیام میں پہلی تکلیف اسکولوں اور دواخانوں کی تھی۔ان دنوں میں بانٹوا انجمن کا سیکریٹری تھا۔چنانچہ میں نے انجمن کے ہی دو مکانوں میں اسکول قائم کردیا۔خدمت کمیٹی کی طرف سے ایک چھوٹا سا دواخانہ بھی شروع کردیا گیا۔اس طرح ابتدائی سطح پر اسکول اور دواخانہ کی تکلیف دور ہوگئی۔

لیکن اب بقیہ 58 پلاٹوں پر تعمیرات کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔میں نے راحت کمیٹی سے پوچھا کہ ان پلاٹوں کی تعمیر کے لئے کیا کیا جائے؟ کمیٹی نے جواب دیا کہ فنڈ نہیں ہے۔تب میں نے صدیق آدم سے اس سلسلے میں بات کی۔انہوں نے بیس بائیس مکانات تعمیر کرانے کی حامی بھری۔میں نے راحت کمیٹی کے سیکریٹری سے کہا کہ کچھ مکانات صدیق سیٹھ تعمیر کرا رہے ہیں اور کچھ مکانات پلاٹ ہولڈر خود بنالیں گے، بقیہ پندرہ سولہ مکانات کی تعمیر کا مسئلہ ہے تو ان کے لئے آپ کو کتنے پیسے چاہئیں؟

راحت کمیٹی کے سیکریٹری نے اندازاً تیس سے چالیس ہزار روپے کا خرچہ بتایا۔اس وقت میں انجمن اور جماعت دونوں کا سیکریٹری تھا اس لئے میں نے جماعت اور انجمن دونوں سے Loan پاس کرا کے راحت کمیٹی کو دیا۔اس طرح یہ پروجیکٹ مکمل ہوگیا۔

آج یہ سب یاد کرتے ہوئے انتہائی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ بانٹوا کا میمن کتنا خوددار ہے۔صرف 17 مکانات زکوٰۃ فنڈ سے تعمیر ہوئے تھے۔اس کے مقابلے میں دوسری جماعتوں کی تو پوری کی پوری کالونیاں ہی زکوٰۃ سے تعمیر کی گئیں اور لوگوں نے ان میں قیام کرلیا۔

پھر بقیہ بانٹوا باشندے بھی Loan ادا کر کے مکانات اپنے اپنے نام کرانے لگے۔چار ہزار روپے والے ان مکانات کی قیمت آج کے حساب سے لاکھوں روپے بنتی ہے۔کھڈا میں رہنے والا باشندہ آج اپنے مکان کا مالک ہے اور ایک طرح سے وہ لکھ پتی ہو چکا ہے۔بلاشبہ یہ بانٹوا جماعت کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔اس میں بانٹوا راحت کمیٹی کے تعاون کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔

راحت کمیٹی کو بعض ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پر یہ کام سپرد کیا گیا تھا اور اس میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ Loan کی قسطوں کی جو رقم واپس آئے وہ بھی نو آبادیات کے مقاصد کے لئے ہی استعمال کی جائے۔لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اس شرط پر عمل درآمد نہیں ہوا۔

2۔بانٹوا ہاؤسنگ سوسائٹی

جس وقت میں جماعت کا سیکریٹری تھا، جماعت کے برادران ''بانٹوا ہاؤسنگ سوسائٹی'' کو اراضی حاصل کرنے کے لئے جماعت کو پیسے دیتے تھے جو بینک میں فکسڈ ڈیپازٹ میں رکھے جاتے تھے۔بینک اس پر سود کے علاوہ فنڈ (Donation) بھی دیتا تھا۔یہ فنڈ ہم راحت کمیٹی کے نام پر لیتے تھے۔میں نے راحت کمیٹی سے اس قسم کا خط بھی تحریر کرالیا کہ جماعت جب بھی نو آبادی قائم کرنے کا آغاز کرے گی اس وقت کمیٹی کو یہ روپے جماعت کو واپس دینے پڑیں گے۔

آج کل جماعت نے ناظم آباد میں غریبوں کے لئے نو آبادی کا کام شروع کیا ہوا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اس نے راحت کمیٹی سے مذکورہ رقم واپس کرنے کا مطالبہ کیا ہے یا نہیں۔بہر حال اسے راحت کمیٹی سے مطالبہ کرنا چاہیے۔

دیکھا جائے تو بانٹوا میمن کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی بانٹوا کے باشندوں کی قائم کی ہوئی اولین سوسائٹی نہ تھی۔اس سے پہلے بھی بانٹوا کے سیٹھوں نے حسینی سوسائٹی اور داؤدسوسائٹی قائم کی تھیں۔لیکن ان کے مقاصد بڑے طبقہ تک ہی محدود تھے۔غریب اور درمیانہ درجے کے بانٹوا باشندوں کے لئے اس قسم کی سوسائٹیز میں کوئی جگہ نہ تھی اور نہ ہی عام میمنوں کو اس سے فائدہ پہنچتا تھا۔

''میمن کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی'' حاجی یوسف ڈونگر گڑھ والے نے قائم کی تھی۔لیکن وہ صرف بانٹوا کے باشندوں کے لئے نہیں بلکہ پوری میمن برادری کے لئے تھی۔حالانکہ اس میں متعدد بانٹوا کے باسی میمن بھی رکن کے طور پر شامل ہوئے تھے۔لیکن حاجی یوسف ڈونگر گڑھ والے کی پوزیشن ہاؤسنگ سوسائٹی کا انتظام وانصرام کرنے کے قابل نہ تھی۔

میرا یقین ہے کہ اگر 1949ء کے بعد ہی بانٹوا میمن کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی قائم ہوگئی ہوتی ہمیں بھی

عالمگیر روڈ پر اراضی حاصل ہو جاتی۔لیکن سیٹھوں نے اس مقصد کے لئے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔بعد میں حکومت نے نئی سوسائٹیز کو رجسٹرڈ کرنا بند کر دیا۔کیونکہ نوآبادیات کے لئے رکھی گئی اراضی تمام رجسٹرڈ سوسائٹیز میں تقسیم کی جا چکی تھی۔بعد میں بھائی سلیمان بھورا نے سوسائٹی کو رجسٹرڈ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن انہیں بہت دیر ہو چکی تھی۔

پھر حکومت نے کراچی امپروومنٹ ٹرسٹ قائم کر دیا۔اس کا قانون یہ تھا کہ ٹرسٹ اجازت دے تو تب ہی سوسائٹی کو رجسٹرڈ کیا جائے گا۔چنانچہ جناب سلیمان بھورا نے ٹرسٹ سے رابطہ قائم کیا۔ٹرسٹ کے چیئرمین نے بے حد تعاون کیا اور نارتھ ناظم آباد میں اراضی فراہم کرنے کے امکانات روشن نظر آنے لگے تو سوسائٹی کو رجسٹرڈ کرالیا گیا۔ہم اراضی دیکھنے گئے اور مخصوص بلاک پسند کئے۔اس کے بعد ہم نے زمین کے پلاٹوں کے لئے بانٹوا کے باشندوں سے درخواستیں طلب کیں۔

شروع میں بھائی جان محمد داؤد کو سوسائٹی کا چیئرمین اور سلیمان بھورا کو سیکریٹری مقرر کیا گیا۔میں اور دوسرے برادران مجلس منتظمہ میں رہے جبکہ سوسائٹی کے منیجر مجید بھائی ونتھلی والا کو مقرر کیا گیا۔عوام کی طرف سے بھی بہت تعاون ملا۔پے منٹ کے طور پر تین لاکھ روپے جمع ہوئے۔پھر تو ہم بسوں میں بھر بھر کر سب لوگوں کو اراضی دکھانے نارتھ ناظم آباد لے گئے اور انہیں ترغیب دی کہ چھ روپے فی گز کے حساب سے یہ اراضی ذرا بھی مہنگی نہیں ہے،اس لئے لے لیں۔یہ بات میمن عوام کی سمجھ میں آ گئی۔اس کے بعد ہم نے بھی امپروومنٹ ٹرسٹ کو زمین کی چوتھی قسط کی ادائیگی کر دی۔

حاجی حبیب،حاجی پیر محمد سیٹھ کی ایک سوسائٹی تھی جو رجسٹرڈ نہیں ہوئی تھی۔ہم نے اس سوسائٹی کو بھی اپنی تھوڑی سی اراضی دینے کا فیصلہ کیا تا کہ وہ مجوزہ ''حسینی یتیم خانہ'' وہاں تعمیر کرائے۔لیکن اللہ عزوجل کے فضل وکرم سے انہیں تین ہٹی کے قریب ہی یتیم خانہ کے لئے اراضی مل گئی،اس لئے انہوں نے ہماری اراضی لینے سے انکار کر دیا۔لیکن بعد میں حاجی حبیب سیٹھ نے مطالبہ کیا کہ ہمیں ہماری پسند کا حصہ دیا جائے۔سلیمان بھورا اور میں نے ان کا یہ مطالبہ منظور کرنے سے انکار کر دیا جس پر وہ ہم سے خفا ہو گئے۔حاجی بندھانی بھی سوسائٹی کے رکن تھے،وہ براہ راست تو انکار نہ کر سکے لیکن بہانہ یہ کیا کہ ٹرسٹ نے جہاں پلاٹس دینے کی منظوری دی تھی،اس جگہ پر اراضی نہیں دی گئی بلکہ اس کے سامنے دی گئی ہے۔

اسی طرح حاجی عمر عبداللہ نے بھی اراضی لینے سے انکار کر دیا۔ اگر چہ یہ صرف ایک بہانہ تھا لیکن جناب سلیمان بھورا نے ہمیں ہدایت کی کہ امپرو ومنٹ ٹرسٹ کے چیئرمین کی شناسائی تلاش کریں۔ غلام علی میمن ہمارے لکڑی کے تاجر اور سندھ اسمبلی کے ممبر تھے۔ ہم نے ان سے بات کی۔ انہوں نے کہا کہ ٹرسٹ کے چیئرمین میراں محمد شاہ سے میری شناسائی ہے آپ کہیں تو ان کے ساتھ ایک کی ملاقات کرا کے آپ کی پسند کی اراضی دلوادوں۔ ہمیں اور کیا چاہیے تھا، ہم نے فوراً ملاقات کا وقت طے کر لیا۔

3۔ پلاٹوں کے حصول کی جدوجہد

امپرو ومنٹ ٹرسٹ کے چیئرمین میراں محمد شاہ نے غلام علی میمن صاحب، سلیمان بھائی اور مجھے عشائیہ کی دعوت دی۔ ہم تینوں ان کے یہاں پہنچے تو انہوں نے بے حد احترام سے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہماری بات توجہ سے سننے کے بعد سوسائٹی نے جس مقام پر اراضی طلب کی تھی وہاں اراضی دینے کی انہوں نے حامی بھر لی۔ عشائیہ سے فارغ ہو کر ہم نے میراں محمد شاہ اور غلام علی میمن کا شکریہ ادا کیا۔

مجلس منتظمہ میں سلیمان بھائی نے اس ملاقات اور کامیابی کا احوال بیان کیا تو جو بہانہ بنایا گیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس اراضی پر سیٹھوں کا قبضہ تھا اور سیٹھوں کا یہ ایک گروہ تھا جو پاکستان فلور ملز میں رہتا تھا۔ ہم اپنی کوشش میں بہت آگے نکل گئے تھے جس سے ایک سیٹھ صاحب کی عزت نفس مجروح ہوئی تھی۔ انہوں نے مزاحمت کرتے ہوئے دوسرا اعتراض کیا کہ بہادر آباد میں کئی سوسائٹیوں کو اراضی ملی ہے تو بانٹوا کے باسی تھوڑا منافع دے کر وہاں اراضی کیوں نہیں خرید لیتے؟

لیکن حقیقت میں بانٹوا کے باسیوں کی مجموعی آبادی کے لئے اتنے پلاٹس وہاں تھے ہی نہیں جو کافی ہو جاتے پھر ہم ان کی بات کیسے مان لیتے۔

بہر حال اس مسئلہ پر سوسائٹی کی جنرل باڈی کا اجلاس طلب کیا گیا جس میں وہ لوگ اپنے متعدد لوگوں کو لے آئے۔ ان کے مقررین نے تقریروں میں ہم سے خریدی ہوئی اراضی میں دنیا بھر کے نقائص نکالے۔ آخر کار اراضی کے بارے میں اس سوال پر ووٹ ڈالے گئے کہ اراضی خریدی جائے یا نہیں؟ مگر ہم پندرہ بیس ووٹوں سے ہار گئے۔ چنانچہ اراضی نہ خریدنے اور اراضی کے روپے واپس لینے کا فیصلہ کیا گیا جو سوسائٹی نے امپرو ومنٹ ٹرسٹ کو

دے رکھے تھے۔

ستار بلوانی اور مجھے اس فیصلے سے بے حد صدمہ ہوا اور اندازہ ہوا کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کی بجائے اس کا کوئی اور راستہ نکالنا چاہیے۔ چنانچہ ستار بھائی اور میں نے کورٹ میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں ہم وکیل عثمان بھائی کے پاس گئے اور ان کے سامنے ساری صورتحال پیش کی۔ عثمان بھائی کو بھی اس بات کا دکھ ہوا۔ انہوں نے کوآپریٹو ایکٹ دیکھ کر بتایا کہ تین ماہ پہلے جنرل باڈی نے تجویز منظور کی ہے کہ اراضی خریدی جائے۔ قانون کی رو سے اس تجویز کو 6 ماہ سے پہلے رد نہیں کیا جا سکتا۔ (گویا چھ ماہ سے پہلے ٹرسٹ سے پیسے واپس نہیں لئے جا سکتے) میں نے سلیمان بھائی کو یہ بات بتائی لیکن وہ بہت غصے میں تھے۔

امپروومنٹ ٹرسٹ سے سوسائٹی کے روپے واپس لینے کے لئے مجلس منتظمہ کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اس اجلاس میں عثمان بھائی کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کوآپریٹو ایکٹ کی متعلقہ شق کا حوالہ دیا کہ جب تک پہلے پاس کی جانے والی (اراضی خریدنے کی) تجویز کو چھ ماہ نہ گزر جائیں دوسری تجویز جنرل باڈی کے سامنے پیش نہیں کی جا سکتی۔

بھائی جان محمد شاید اس قانون سے واقف نہ تھے۔ بہر حال میری اور محمد عبداللہ کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور وکیل عثمان بھائی سے ایک بار پھر مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ہم دوبارہ عثمان بھائی کے پاس گئے اور متعلقہ ایکٹ کے بارے میں تفصیل سے بات کی۔ اس طرح میں نے مذکورہ تجویز رد کر دی۔ لیکن سلیمان بھائی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ ایک ہی بات پر اڑے رہے کہ جن جن سے روپے لئے ہیں ان سب کو واپس دے دو۔ میں کچھ نہیں کروں گا، تمہارے ساتھ تعاون بھی نہیں کروں گا۔ ہم نے سلیمان بھائی سے کہا کہ جنہیں اراضی نہ خریدنی ہو وہ اپنی مرضی سے رقم واپس لے لیں، آپ صرف ہمارے سرپرست بنے رہیں، میں اور ستار بلوانی عدالت کے ذریعے بھی یہ تجویز رد کرا دیں گے۔ لیکن ہمارے سمجھانے بجھانے کا سلیمان بھائی پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اس کے بعد پھر جنرل باڈی کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اس میں بھی تجویز کی حمایت اور مخالفت میں تقاریر ہوئیں لیکن آخر کار یہ تجویز منظور کر لی گئی کہ اراضی نہیں لینی۔ اس کے بعد کیا ہو سکتا تھا۔ سلیمان بھائی نے اپنا استعفیٰ ارسال کر دیا۔ میں اگرچہ ایک سال تک رہا لیکن نئے انتخابات میں بطور امیدوار حصہ نہ لیا۔

جان محمد بھائی کو امپرومنٹ ٹرسٹ سے اراضی کے روپے لینے میں ڈیڑھ سال لگ گیا۔حکومت کی طرف سے بھی کہا گیا کہ اراضی چھوڑنے والی نہیں ہے،آپ کو پسند کی اراضی مل رہی ہے، لے لیں۔لیکن جان محمد بھائی بے بس اور لاچار تھے۔بہر حال اراضی کے پیسے واپس مل گئے۔اس کے بعد تو وہ خود بھی ہار گئے تھے۔

سوسائٹی نے ہر مقام پر اراضی حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد آخر کار سبزی منڈی کے قریب اراضی خرید لی جس میں 500 خاندانوں کی آبادکاری کی گنجائش تھی اور وہاں کام شروع کر دیا گیا۔اس کے علاوہ اسکیم نمبر 33 میں بانٹوا سوسائٹی اور مدینہ سوسائٹی کو 60 اور 20 ایکڑ اراضی ملی۔میں نے اپنی جیلانی کوآپریٹو سوسائٹی قائم کی تھی جس میں ایک ہزار اراکین بنائے تھے۔لیکن جیلانی سوسائٹی کو اراضی نہ ملی۔اس کے لئے خصوصی طور پر کوشش بھی نہیں کی گئی۔بانٹوا کے سیٹھوں نے اس نوآبادی کے منصوبہ کو ناکام بنانے کے لئے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

ناظم آباد کی جس اراضی کے پیسے جان محمد بھائی نے واپس حاصل کر کے لوگوں کو لوٹائے تھے وہاں بوہرہ بھائیوں نے اپنی کالونی آباد کی ہے جو آج کل ''برکات حیدری'' کے نام سے مشہور ہے۔

☞ ☞ ☞

بانٹوا انجمن حمایت اسلام

بانٹوا میں زنانہ دواخانہ اور قبرستان کے انتظامات آخر تک بانٹوا انجمن نے سنبھالے تھے۔ہجرت کر کے کراچی آنے کے بعد اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ کراچی میں عام مسلمانوں کی میت کو قبرستان پہنچانے کی سرگرمی شروع کرنی چاہیے۔کیونکہ قبرستان شہر سے کافی دور تھا اور سب کو کفن دفن کی دشواری تھی۔اس لئے آدم سیٹھ نے حاجی کریم نینی (Nini) سے کہا کہ کراچی میں انجمن قائم کی جائے۔انہوں نے کھوڑی گارڈن میں واقع اپنے آفس کا ایک کمرہ انجمن کا دفتر بنانے کے لئے دے دیا۔اس طرح کراچی میں بانٹوا انجمن نے کام شروع کر دیا۔

انجمن کی طرف سے قبرستان میں قبر کھودنے والے کورکن اور غسل دینے والے مولوی کا انتظام کیا گیا اور میت کو قبرستان پہنچانے کے لئے دو پرانی بسیں بھی خریدی گئیں۔فرقہ و برادری کے امتیاز کے بغیر یہ خدمت سب مسلمانوں کو پیش کی جاتی تھی۔لاوارث میت کے کفن دفن کے سارے کام فی سبیل اللہ یعنی مفت کئے جاتے تھے۔ (اور یہ خدمت آج بھی جاری ہے)۔

کراچی کے عوام کے لئے یہ انتظامات ایک نعمت ثابت ہوئے اور انجمن کو بھی اس کام میں بچت ہونے لگی۔بانٹوا سے بھی انجمن کے روپے یہاں آ گئے تھے۔البتہ دیگر سرگرمیوں کے لئے امداد لینی پڑتی۔کراچی میں بھی حاجی کریم نینی انجمن کے صدر اور سلیمان بھورا سیکریٹری تھے۔اس کے علاوہ تقریباً 20 اراکین بھی نامزد کئے گئے تھے۔

میں 1956ء میں کراچی کی بانٹوا انجمن کا ممبر بنا۔اس وقت حاجی کریم نینی بیمار رہتے تھے اس لئے سلیمان بھائی کے کہنے پر میں نے انجمن کے سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا جبکہ سلیمان بھائی انجمن کے صدر بن گئے۔انجمن کا نظم ونسق چلانے کے لئے ہم نے ایک پیڈ سیکریٹری بھی رکھا۔انتخابی نظام نافذ تھا۔ہر ایک رکن کو فارم (بیلٹ پیپر)

ارسال کئے جاتے، اگر وہ کراچی سے باہر یعنی بیرون کراچی ہوتا۔ پھر وہ صدر، سیکریٹری اور بورڈ کے ممبروں کے نام کے سامنے کراس (X) کا نشان لگا کر ووٹ ڈالتا۔

میں 1964ء تک انجمن کا سیکریٹری رہا۔ بعد میں ممبران کو ارسال کئے جانے والے فارم کے ساتھ میں نے ایک پرچی (Slip) لگا دی جس پر میں نے لکھا کہ مجھے منتخب نہ کیا جائے، میں فی الحال انجمن میں کوئی بھی عہدہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے باوجود بھی چند افراد نے مجھے ووٹ دیئے۔ حالانکہ نظام عمل تو یہ ہے کہ ایک آدمی انکار کرے تو اسے زبردستی منتخب نہیں کرنا چاہیے۔

اس کے بعد صدیق پولانی ایک میٹنگ میں انجمن کے سیکریٹری کے طور پر منتخب ہوئے۔ میں اس میٹنگ میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔

بانٹوا انجمن کراچی کی اور بھی متعدد سرگرمیاں رہیں۔ مثلاً جب فیڈرل بی ایریا میں بانٹوا کے باشندوں نے رہائش اختیار کی تو انجمن کی طرف سے ہنگامی طور پر وہاں ایک اسکول قائم کیا گیا تا کہ اس نوآبادی کو تعلیمی سہولت بھی میسر ہو۔

انجمن غریب میمن طلباء کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا کر ان کے خورد و نوش کے ماہانہ اخراجات بھی بورڈنگ ہاؤس کو ادا کرتی تھی۔ میڈیکل کے ایک طالب علم جس کا تعلق بانٹوا سے تھا، اس کے ڈاکٹری کے امتحان میں پاس ہونے تک تمام اخراجات انجمن نے برداشت کئے تھے۔

بانٹوا انجمن کے پاس جو فاضل روپے تھے وہ نیشنل بینک کے شیئرز میں لگا دیئے گئے تھے۔ میری سیکریٹری شپ کے بعد بھی اگرچہ کفن دفن کا کام جاری رہا تھا لیکن دوسرے اداروں نے بھی یہ نیک کام شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے کام کا دباؤ انجمن پر بہت کم رہ گیا۔

سلیمان بھائی کی وفات کے بعد انجمن کے صدر کا عہدہ خالی تھا۔ چنانچہ یوسف دادا کو انجمن کا ممبر بنا کر انہیں صدر منتخب کیا گیا تو مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی حالانکہ میں ممبر تھا اور مجھے اس بات کی اطلاع دی جانی چاہیے تھی۔

پھر جب مجھے پتا چلا تو میں نے مخالفت کی۔ کیونکہ ابتداء سے ہی انجمن کی پالیسی یہ تھی کہ اس میں کسی سیٹھ کو رکن یا عہدہ دار نہیں بنایا جائے گا۔ اس پر صدیق بھائی نے مجھے صدارت کے عہدہ کی پیشکش کی لیکن میں نے کہا کہ آپ خدمت کمیٹی میں ہیں اس لئے میں آپ کو سیکریٹری نہیں بننے دوں گا۔ چنانچہ میں نے غلام حسین کارا سے سیکریٹری کے عہدہ کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرائے۔ اسی طرح انجمن میں ہمارے اختلافات کا آغاز ہوا۔

مخالف گروپ کے یوسف دادا صدارت اور صدیق بھائی منصب سیکریٹری کے لئے امیدوار بنے تھے۔ لیکن ایک ووٹ سے ہماری جیت ہونے کے باوجود انہوں نے یہ ووٹ اپنے ووٹوں میں شمار کرتے ہوئے ہمیں شکست خوردہ ظاہر کیا۔ اس زیادتی پر ہم ثالثی کے طویل پنچایتی فیصلے میں ملوث نہیں ہونا چاہتے تھے۔

چنانچہ میں نے سالانہ چندہ کا ایک روپیہ بھی ادا نہ کیا اور اس طرح میں انجمن کا عام رکن بھی نہ رہا۔ کیونکہ جہاں ایسی گھپلا بازی ہوتی ہو وہاں پھر میرے جیسا آدمی کام نہیں کر سکتا۔ بعد میں صدیق بھائی نے کئی آدمیوں کے سامنے اقرار کیا تھا کہ انہوں نے غلط طریقے سے ہمارے گروپ کو شکست دی تھی۔

دیکھا جائے تو بانٹوا انجمن کام اچھے کرتی ہے۔ شادی مدد کے لئے فنڈ جمع کرتی ہے۔ فطرہ کی رقم جمع کرتی ہے۔ ارزاں قیمت پر نوٹ بکس مہیا کرتی ہے۔ سلائی مشینیں دیتی ہے، اول منزل قبرستان تک میت کو پہنچانے کا کام انجام دیتی ہے۔ میں نے انجمن چھوڑ دی مگر اس کے بعد انجمن نے کسی سیٹھ کو عہدہ نہیں دیا۔ اس لئے مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ میں تمام اداروں میں نہیں پہنچ سکتا۔ میں اصول پسند ہوں، میں اصول کے لئے لڑا ہوں، عہدے کے لئے نہیں۔ اسی لئے تو میں نے انجمن چھوڑ دی۔

ایک دفعہ عبداللہ حاجی حبیب نے مجھے طلب کر کے کہا کہ ہم اپنی اراضی کا کچھ حصہ بانٹوا کے باشندوں کے لئے انجمن کو دیتے ہیں۔ اس پر میں نے ان کے قومی جذبے کی تعریف کی اور شکریہ کے ساتھ ان کی پیشکش قبول کر لی۔

بانٹوا میں دواخانہ، بانٹوا انجمن کی ملکیت تھا اس لئے کراچی آنے کے بعد ہم نے اس کا کلیم ہجرتی ملکیت

کے طور پر داخل کیا اور وکیل کے ساتھ سودا کیا کہ کلیم سے جو کچھ بھی ملے گا اس میں سے پانچ فیصد اس کا ہوگا۔ لیکن وکیل نے بتایا کہ ادارہ ہجرتی ملکیت کا کلیم نہیں کر سکتا اس لئے آپ کو اس قسم کے مطلب و معنی کا اسٹیٹمنٹ دینا پڑے گا کہ ہم تمام اراکین ہجرت کر کے یہاں آ گئے ہیں اور انجمن کے اراکین ہونے کے ناتے اس جائداد کا کلیم ہمیں ملنا چاہیے۔

چنانچہ ہم نے ایسا ہی اسٹیٹمنٹ تیار کیا اور میں خود یہ کاغذ لے کر متعلقہ افسر عباسی صاحب کے پاس گیا جنہیں کلیم منظور کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ انھوں نے مجھ سے اسٹیٹمنٹ لے لیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بانٹوا میں ہم نے دواخانہ کے لئے اراضی درباروں سے کسی بھی حساب سے مفت نہیں لی تھی بلکہ قیمتاً خریدی تھی، متعلقہ اراضی ہم نے محمد حاجی رحمت اللہ کو فروخت کی ہے۔ اس کے کرایہ کے متعلق ہم نے دو گواہ بھی پیش کئے۔ کیونکہ کلیم چالیس سال کے کرائے کے کردار پر منظور ہوتا تھا۔

لیکن عباسی صاحب نے کہا کہ ادارہ ہجرتی ملکیت کا کلیم داخل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہمارا کلیم منظور نہ ہوا۔ اسی عرصہ کے دوران کراچی کاٹن ایسوسی ایشن کو بھی حکومت نے ہجرتی ملکیت ہونے کا اعلان کیا تھا اور اس کا مقدمہ ہائی کورٹ میں چل رہا تھا جس سے ہمارا وکیل واقف تھا۔ ہائی کورٹ کا فیصلہ یہ آیا کہ یہ ادارہ اس کے اراکین کی ملکیت ہے۔

ہمارے بھی کافی اراکین کراچی میں تھے۔ ہم نے چند نئے اراکین بنانے کے بعد اعلان کیا کہ انجمن بھی اراکین کی ملکیت ہے۔ اس کے ہی اراکین ہجرت کر کے کراچی آئے ہیں اور پرانے نام پر ہی ادارہ چلا رہے ہیں۔ اس طرح ہمارا ساڑھے چار لاکھ روپے کا کلیم منظور ہو گیا اور بک بھی تیار ہو گئی۔ یہ کلیم پچاس ساٹھ فیصد کے حساب سے فروخت کیا گیا اور روپے انجمن میں جمع کرا دیئے گئے۔

اس مقدمہ میں سلیمان بھائی اور میں نے ذاتی طور پر کافی محنت کی تھی۔

دوسری جانب بانٹوا جماعت کا مقدمہ بھی ہمارے مقدمہ جیسا ہی تھا۔ ان لوگوں نے بھی جماعت کے علاوہ

اسکولز اور لائبریری کی ملکیت کا کلیم داخل کرایا۔ بھائی جان محمد داؤد وکیل تھے اور جماعت کے اسکولوں اور مدرسوں کے ممبر بھی تھے۔ ان لوگوں نے بھی ہماری ہی طرح زمینیں خرید کر سب کچھ بنایا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اس کے غلط ٹرسٹ بنائے اور مذکورہ تمام ملکیت کو ٹرسٹوں کی ملکیت ظاہر کیا اور ان ٹرسٹوں نے ہجرتی ملکیت کے کلیم داخل کرائے۔

اسی دوران پاکستان اور بھارت دونوں حکومتوں نے اعلان کر دیا تھا کہ مساجد، مندروں اور ٹرسٹوں کی ملکیت کو ہجرتی ملکیت ظاہر نہ کیا جائے اور ان کے کلیم بھی دونوں حکومتیں منظور نہیں کریں گی۔ چنانچہ اسی وجہ سے بانٹوا جماعت والوں کا غلط ٹرسٹوں کے ذریعے داخل کیا گیا کلیم منظور نہ ہوا اور انہیں اپنے مقصد میں بری طرح ناکامی ہوئی۔

بعد میں بانٹوا جماعت والوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور مجھ سے انجمن کے حق میں ہونے والے فیصلوں کی نقل مانگی۔ میں نے وکیل سے مشورہ کرنا ضروری اور مناسب سمجھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بانٹوا جماعت کے ساتھ ہماری کشتی بھی ڈوب جائے۔ لیکن وکیل نے کہا کہ آپ بے شک اپنے فیصلے کی نقل انہیں دے دیں، دونوں اداروں کا کردار الگ ہے، آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ میں نے انہیں نقل فراہم کر دی۔ جماعت والوں نے انجمن کی دلیل دیتے ہوئے دوبارہ کلیم داخل کیا۔ لیکن جواب یہی آیا کہ انجمن ایک ادارہ ہے اور آپ ٹرسٹ ہیں، اس لئے آپ کا کلیم منظور نہیں ہوگا۔ اس طرح بانٹوا جماعت والوں نے غلط ٹرسٹ بنا کر کروڑوں روپے کے کلیم ضائع کر دیے۔

بعد میں جب میں جماعت کا سیکریٹری بنا تو اس وقت میں نے پھر سے وکیل کو جماعت کا مقدمہ دکھایا اور اس سے کہا کہ کوئی راستہ ہو تو بتائیں۔ وکیل نے کہا کہ ابھی کچھ نہیں ہو سکتا، حکومت جب ٹرسٹوں کے کلیم داخل کرنے کو کہے تو آپ بھی داخل کرا دیجئے گا۔ اس لئے میں نے بھی اس معاملہ کو ٹھپ کر دیا۔

بہر حال کلیم ملنے سے انجمن مالی نقطہ نظر سے مستحکم ہوگئی اور کسی کے فنڈ کے بغیر ہی اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی اور خود کفیل ہوکر اپنے وسائل پر ہی انحصار کرنے لگی۔

عکسِ بانٹوا

مولانا عبدالستار ایدھی

عالمی شہرت یافتہ سماجی کارکن مولانا عبدالستار ایدھی کے دل میں ابتدا ہی سے دکھی انسانیت کا درد تھا اور ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دھن کے پکے انسان ہیں، جو بھی کام کرتے ہیں انتہائی محنت اور لگن سے کرتے ہیں۔ یہ کام کرنے کا جذبہ اور امنگ ہی ہے جس نے آج عبدالستار ایدھی کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ یہ غیر معمولی کھدر پوش شخص صلے اور ستائش کی پرواہ کئے بغیر انسانیت کی خدمت میں سرگرم ہے۔ ان کی ''ایدھی ایمبولینس'' خدمت اور عظمت کی علامت بن چکی ہے۔

عبدالستار ایدھی کے سماجی خدمت کے شوق اور جنون کو دیکھتے ہوئے بانٹوا انجمن نے اپنے والینٹر کور کی جگہ پر ایک زنانہ دواخانہ کھلوا دیا تھا۔ چونکہ دواخانے میں غریب اور نادار مریضوں کا علاج ہوتا تھا لہذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ مفلس اور کم آمدنی والی خواتین سے صرف چار آنے فیس لی جائے۔ ان دنوں سلیمان بھورا موجود نہیں تھے، اس لئے مولانا عبدالستار ایدھی کو زنانہ دواخانہ میں نے شروع کروایا تھا اور مجھے خوشی ہے کہ عبدالستار ایدھی نے شب و روز محنت کر کے ہزاروں مجبور اور لاچار مریضوں کا علاج کروایا ہے۔ ابتداء میں عبدالستار ایدھی زنانہ دواخانے سے کچھ گھبرا رہے تھے مگر کچھ ہی عرصے میں ان کی جھجھک دور ہوگئی اور دواخانہ بہت اچھا چلنے لگا۔ عبدالستار ایدھی نے زنانہ دواخانے کے کئی کام خود سنبھال رکھے تھے وہ تنخواہیں تقسیم کرتے اور دواخانے کا حساب کتاب بھی خود تحریر کرتے تھے۔

بانٹوا انجمن کے تحت قائم کیا گیا زنانہ دواخانہ علاقے کی مستحق خواتین کی اچھی خدمت کر رہا تھا۔ کئی ماہ گزرنے کے بعد عبدالستار ایدھی نے مجھ سے کہا کہ بانٹوا انجمن کے قائم کردہ زنانہ دواخانے کو میرے سپرد کر دیجئے اور بانٹوا انجمن کی دی گئی رقم مجھ سے لے لیں۔ ان دنوں حسین کارا بانٹوا انجمن اور والینٹر کور دونوں کے رکن تھے ان کا اصرار بھی یہی تھا چنانچہ عبدالستار ایدھی نے بانٹوا انجمن کے روپے واپس کر دیئے اور زنانہ دواخانہ بانٹوا میمن والینٹر کور کی جانب سے جاری رکھا گیا۔

مجھے خوشی اور فخر ہے کہ شہرت کے آسمان کے درخشاں ستارے عبدالستار ایدھی نے اپنی سماجی خدمات کی ابتداء بانٹوا میمن انجمن کے زنانہ دواخانے سے کی تھی، عبدالستار ایدھی کے حساب کتاب کے رجسٹر آج بھی بانٹوا انجمن میں ایک یادگار کے طور پر محفوظ ہیں۔

عکسِ بانٹوا

بانٹوا میمن خدمت کمیٹی

بانٹوا میں کچھ جوانوں نے میمن سیوا سمیتی (خدمت کمیٹی) کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی تھی۔اس کا مقصد معاشرے میں موجود غلط رسوم کو ختم کرنے کے لئے عملی تعاون مہیا کرنا تھا۔ جماعت جو بھی قوانین وضوابط وضع کرتی،اس کے والنٹیئر کو اس کا دھیان رکھتے تھے کہ ان قوانین پر عمل کر دیا جاتا ہے یا نہیں۔بانٹوا میں سیوا سمیتی مختلف خدمات انجام دیتی رہی۔

شادی بیاہ میں ڈھول باجے بجانے کا رواج ختم کرنے کا ضابطہ آیا تو اس کی جگہ میلاد کی رسم شروع ہوئی اور میلاد پڑھنے والے میلاد پڑھتے پڑھتے بارات کو دلہن کے گھر لے جاتے۔مگر پھر میلاد پڑھنے والے زیادہ معاوضہ مانگنے لگے تو سیوا سمیتی کے جوانوں نے خود میلاد پڑھنے کی ذمہ داری اٹھالی۔وہ خود میلاد پڑھتے اور باراتیوں کی قیادت کرتے ہوئے انہیں دلہن کے گھر لے جاتے تھے۔اس کے علاوہ بھی سیوا سمیتی متعدد سرگرمیاں چلاتی تھی۔سیوا سمیتی کے والنٹیئر محرم الحرام کے پہلے عشرے میں خصوصی خدمات سرانجام دیتے تھے۔جب بانٹوا پر بھارت نے قبضہ کیا،اس وقت یہ والنٹیئر ہی ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتے تھے۔اس ادارے میں بھائی حسین دھامیا نے خصوصی کردار ادا کیا تھا۔

ہجرت کر کے کراچی آنے کے بعد بانٹوا جماعت اور بانٹوا انجمن کی بنیاد تو ڈال دی گئی۔لیکن سیوا سمیتی کی بطور ''بانٹوا میمن خدمت کمیٹی'' بنیاد ڈالنے میں کچھ دیر ہوگئی۔شروع میں خدمت کمیٹی کی جانب سے ایک چھوٹی سی جگہ پر ایک دواخانہ کھولا گیا۔اس کے لئے حاجی عثمان ایدھی نے چار ہزار روپے کا عطیہ دیا۔

بانٹوا میمن خدمت کمیٹی کے پہلے صدر حاجی عثمان ایدھی اور پہلے سیکریٹری بھائی صدیق پولانی مقرر ہوئے۔دوسرے لوگ بھی عہدہ دار اور ممبر زبنے۔یہ دواخانہ اچھا چلا اور ترقی کرتا رہا۔اس کے صدر تبدیل ہوتے

رہے لیکن عرصہ دراز تک بھائی صدیق پولانی ہی سیکریٹری رہے ۔ وہ روزانہ وقت مہیا کرتے تھے ۔ لیکن اراکین میں اضافہ ہوتے رہنے سے رقابت بڑھتی چلی گئی ۔ انتخابات بھی ہر سال ہوتے تھے ۔

ایک مرتبہ ستار مولانا صدر منتخب ہوئے مگران کے ساتھ صدیق بھائی کے تعلقات اچھے نہ تھے ۔ اس وقت صالح محمد کالیا نے مجھ سے کہا کہ تم مجلس منتظمہ میں آجاؤ کیونکہ دونوں فریقوں میں موزونیت ومناسبت نہ ہونے کے باعث دماغ سوزی ختم کرنے میں مدد ملے گی ۔ چنانچہ انہوں نے مجھے مجلس منتظمہ کا رکن بنا کر مجلس میں شامل کرلیا ۔ میرے رکن بننے کے بعد اللہ عزوجل کے فضل وکرم سے سب کچھ ٹھیک چلتا رہا ۔ شاذونادر ہی ستار مولانا اور صدیق بھائی میں بکھیڑا اور گڑبڑ ہوجاتی تو میں انہیں اچھے طریقے سے سمجھا بجھا لیتا ۔

خدمت کمیٹی نے اسپتال بنانے کے لئے کام شروع کیا تو آغاز میں دو منزل کی عمارت تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ لیکن میں نے کمیٹی والوں سے کہا کہ آپ ہمت کریں اور پانچ منزلیں بنائیں کیونکہ دو منزلوں میں اول تو تمام سہولتیں فراہم نہیں ہوسکیں گی، پھر دواخانہ ایک مرتبہ شروع ہوجانے کے بعد تعمیراتی کام کرنے میں سہولت نہ ہوگی ۔ مجھے جواب ملا کہ فنڈ نہیں ہے، اس کا کیا کریں؟ میں نے ان کی ہمت بندھائی اور کہا کہ اچھے کام کے لئے فنڈ مل ہی جاتا ہے ۔ میری باتوں سے سب مطمئن ہوگئے اور انہوں نے مجھے تعمیر کمیٹی میں شامل کرلیا ۔ اس کے بعد مجھے خدمت کمیٹی کا وائس چیئرمین منتخب کیا گیا ۔ اس وقت خدمت کمیٹی کے صدر بھائی یوسف دادا تھے ۔

ایک بات بتادوں کہ کام کرنے کے میرے اپنے اصول ہیں ۔ میں ان لوگوں کی کارکردگی سے مطمئن نہ تھا ۔ صدیق بھائی ہمیشہ سیٹھوں کو کمیٹی کا صدر بناتے اور مجلس منتظمہ میں بھی شریک کرتے ۔ سیٹھ صاحبان صرف جنرل میٹنگ میں آتے اور زیادہ وقت باہر ہی رہتے ۔ وہ یہ بھی دیکھنے نہ آتے کہ اسپتال میں کیا ہورہا ہے ۔ اور تو اور روپے پیسے کی ضرورت آپڑتی تو وہ بھی نہ دیتے ۔ اس لئے ادارے کو قرض (Loan) لینے کے لئے بینک میں اپنے شیئرز رکھنے پڑتے ۔ صرف نام کی خاطر سیٹھوں کو صدر بنانا میرے اصول کے خلاف تھا اس لئے میں نے آئندہ انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کردیا تھا ۔

عکسِ باٹوا

کافی عرصہ بعد صدیق بھائی ایک مرتبہ پھر میرے پاس آئے۔اس وقت کمیٹی کے صدر کے ساتھ ان کے اختلافات تھے۔انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ صدر کے عہدہ کے لئے امیدوار بن جائیں۔ان کا اصرار اور دباؤ بہت بڑھ گیا تو میں نے عہدہ صدارت کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرا دیے جبکہ صدیق بھائی سیکریٹری کے عہدہ کے لئے کھڑے ہوئے۔ہماری ایک تنظیم یا گروپ بن گیا۔لیکن الیکشن میں ہم سب کو شکست ہوئی۔

اس شکست کی وجہ یہ تھی کہ صدیق بھائی نے تمام سیٹھوں کو ممبر بنایا تھا اور ووٹ دینے والے سب سیٹھ صاحبان تھے۔میری تو شروع سے ہی سیٹھوں سے ان بن رہتی تھی۔دوسری وجہ یہ تھی کہ چند افراد صدیق بھائی کو پسند نہ کرتے تھے۔بہر حال !بعد میں نوجوانوں کا ایک گروپ میرے پاس آیا اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہم آپ کا احترام کرتے ہیں لیکن آپ صدیق بھائی کے گروپ سے الگ ہو جائیں،ہم آپ کو صدر بنا دیں گے۔لیکن میں نے انکار کر دیا۔

صدیق بھائی سے میرے لاکھ اختلافات سہی لیکن میں ہمیشہ ورکرز کی قدر کرتا رہا ہوں۔صدیق بھائی روزانہ اسپتال کو تین چار گھنٹے کا وقت دیتے تھے اور وقت بے وقت بھی چکر لگانے آجاتے تھے۔میری نظر میں ایسا کوئی دوسرا فرد نہ تھا۔

سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ اتنے سارے برسوں کا تجربہ بھی بیش بہا اور قیمتی ہوتا ہے۔نئے سیکریٹری کو تجربہ حاصل کرنے میں وقت لگتا ہے اور میں اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ اسپتال میں ہر سال نئے طالب علم کی طرح ناتجربہ کار افراد داخل ہوں۔اپنے نقطہ نظر کے مطابق میں ذاتی قربانی دینے والے کی قدر کرتا ہوں۔انسان غلطیاں کرتا ہے لیکن اس کے کام پر نظر رکھتے ہوئے درگزر کرتے رہنا چاہیے۔سارے افراد کو تو کوئی بھی عہدہ دار مطمئن نہیں کر سکتا۔

بہر حال اپنی شکست کے بعد میں نے خدمت کمیٹی چھوڑ دی۔کیونکہ جہاں شکست ہو جائے میں وہاں نہیں رہتا۔انجمن میں بھی میں اسی اصول کی وجہ سے نہ رہا تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ آج کل خدمت کمیٹی میں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے کمیٹی کے عہدہ داروں سے کی گئی گفتگو سے پتا چلتا ہے کہ زکوٰۃ فنڈ اور دوسرے فنڈز میں بارہ تیرہ لاکھ روپے پڑے ہیں۔ اس پیسے کو سود پر دے کر جنرل فنڈ میں جمع کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے میری نظر میں کمیٹی کے عہدہ دار اللہ تعالیٰ کے مجرم اور گناہگار ہیں۔ کیونکہ شریعت کے مطابق زکوٰۃ کی تقسیم فوری ہونی چاہئے۔

اب دریافت کیا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کا استعمال کیسے کیا جائے؟ استعمال کے لئے تو متعدد راستے ہیں۔ ضرورت مندوں کو رہائش کے لئے مکانات بنا کر دیے جا سکتے ہیں۔ اور بھی متعدد کارِ خیر ہیں۔ دوسری دلیل جو یہ لوگ دیتے ہیں کہ کسی سال فنڈ حاصل نہ ہوا تو کیا ہوگا؟

جواب میں میں اپنے سالہا سال کے تجربے سے کہتا ہوں کہ اتنے برسوں سے میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کارِ خیر کے لئے فنڈ نہ ملے۔ بلکہ زیادہ خرچ کرنے سے فنڈ میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ عہدہ داروں پر تنقید کے طور پر تحریر نہیں کر رہا ہوں بلکہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ایک اخلاقی اور قومی فرض ادا کر رہا ہوں۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، اس کی مرضی ہے۔

عکسِ باٹوا

بانٹوا محمڈن لائبریری

بانٹوا کے باشندوں کو برصغیر کے دیگر مسلمانوں کی طرح حصول علم اور مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔غربت اور پسماندگی کی وجہ سے کتابیں خریدنا اور اپنی علم کی پیاس بجھانا بہت مشکل تھا۔لوگوں میں علم کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے بانٹوا میں ایک لائبریری قائم کی گئی جس کا نام محمڈن لائبریری رکھا گیا تھا۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔محمڈن لائبریری سے زیادہ تر مسلمان استفادہ کرتے تھے اور ان میں بھی اکثریت طالب علموں کی ہوتی تھی مگر محمڈن لائبریری میں مطالعہ کے شوقین ہندو بھی آتے تھے۔

کراچی آمد کے بعد بانٹوا میمن کمیونٹی کے تحت کئی تعلیمی ادارے قائم کئے گئے مگر بانٹوا کی محمڈن لائبریری کے طرز پر کوئی کتب خانہ قائم نہیں ہو سکا۔

میں جب بانٹوا انجمن کا سیکریٹری تھا تو میں نے محدود پیمانے پر کتابوں اور چند اخبارات کا انتظام کیا تھا اور یہ کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا۔ دراصل کتب خانے قوموں کے اعلیٰ معیار کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔لائبریری کے قائم ہونے سے خصوصاً ان افراد کو بہت فائدہ ہوتا ہے جو محدود آمدنی کی وجہ سے کتابیں خرید نہیں پاتے۔اب حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں وسائل بڑھنے سے چھوٹے بڑے کتب خانے قائم ہو رہے ہیں ان میں کئی لائبریریاں میمن تاجروں اور سماجی رہنماؤں نے قائم کی ہیں۔

بانٹوا میں جتنے اداروں سے میں واقف تھا ان کا تذکرہ میں نے کر دیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ کوئی ادارہ میری یادداشت سے نکل گیا ہو۔

☞ ☞ ☞

اصلاح معاشرہ کی کاوشیں

بری رسوم ورواج کوختم کرنے اور معاشرے کی اصلاح کے لئے بھائی پیر محمد کالیا نے پورے خلوص سے کوششیں کیں اوراس مقصد کے لئے ایک اصلاحی انجمن قائم کی لیکن انجمن کامیاب نہ ہوسکی۔بانٹوا اجماعت میں میری سیکریٹری شپ کے تحت اصلاح معاشرہ کی سرگرمیوں کوتیز تر کیا گیا۔نئے آئین میں تجویز کیا گیا کہ اصلاح معاشرہ کے لئے عوام الناس سے گیارہ ارکان کومنتخب کیا جائے۔

میرے منصب سیکریٹری کے تحت ایک وومن سوسائٹی بھی قائم کی گئی۔پگڑی کی لعنت اور دوسری بری رسوم کو نیست ونابود کرنے کے لئے قوانین اورضوابط ترتیب دیے گئے۔اس کے علاوہ خواتین کا اجلاس طلب کرنے کے بعد الیکشن کرا کے انہیں باقاعدہ منظم کیا گیا۔

وومن سوسائٹی کی اولین صدر حور بائی حاجیانی اور سیکریٹری رقیہ بائی کوئی لانا والا چنی گئیں۔اس نسوانی ادارے کا ماہانہ اجلاس مدرسۂ اسلامیہ میں ہوتا تھا اور ادارے کے تمام اخراجات میں خود برداشت کرتا تھا۔لیکن اس کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں تھی۔

ایک مرتبہ خواتین کے اجلاس میں ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ کی گئی اور خواتین آپس میں ناراض ہوگئیں۔اس لئے بعد میں میں نے اس ادارے کوختم کردیا۔کیونکہ قوانین اورضوابط پر عمل درآمد نہ ہوتا تھا۔اور سب سے بڑا نقص یہ نظر آیا کہ عام آدمی قوانین وضوابط کی خلاف ورزی کرتے تو ادارہ آسمان سر پر اٹھالیتا اوراس آدمی کو جرمانہ کر کے وصول کرتا۔لیکن ادارے کے سربراہ اگر قانون وضوابط کی خلاف ورزی کرتے تو اس کا نوٹس تک نہ لیا جاتا۔اگر کوئی شور برپا ہوتا تو اسے دبا کرختم کردیا جاتا تھا۔

ایک سیٹھ کے ڈیپازٹ کی رقم میں نے خود ادا کردی اور پرچی بنادی تو وہ ناراض ہوگئے اگر چہ بعد میں انہوں نے مجھے روپے ادا کردیے۔

اپنے منصب سیکریٹری کے دوران میں ضابطہ خلافی، منگنی توڑنے یا طلاق کے مقدمے ہاتھ میں نہ لیتا تھا۔ بلکہ یہ سب میں کمیٹی کے سپرد کر دیتا تھا۔ البتہ میاں بیوی کی ناراضگی اور ناچاقی کے مقدمات میں خود ذاتی طور پر جماعت سے باہر ہی حل کرا دیتا تھا۔ اس قسم کے مقدمات میں فیصلہ کمیٹی میں جانے ہی نہ دیتا تھا۔ ایسے مقدمات میں اکثر ایسے ہی معاملات ہوتے جیسے کہ بچے کی ولادت کے وقت اخراجات کے روپے کیوں نہیں دیے گئے؟ اس پر ناراضگی شروع ہو جاتی۔ اس لئے میں فریق ثانی کو طلب کر کے اس کے قریبی رشتہ داروں کو درمیان میں بٹھا کر فیصلہ کر دیتا اور جن کے پاس پیسہ نہ ہوتا انہیں میں اپنے فنڈ سے پیسے دے کر سمجھوتا کرا دیتا تھا۔

ایک مرتبہ مجلس منتظمہ میں بھائی حسین دھامیا نے شور مچایا کہ سیکریٹری صاحب خود ہی ضابطہ شکنی کرتے ہیں اور روپے دیتے دلاتے ہیں۔ ان کی اس دہائی پر میں کھڑا ہو گیا اور دو تین مثالیں پیش کر کے کہا کہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ہزار دو ہزار روپے کے لئے دو تین بچوں کی ماں کو طلاق ہو جائے۔ اس میں میں خود کو گناہگار شمار کرنے لگتا ہوں اور ضابطہ شکنی پر جماعت مجھے جو کچھ بھی سزا دے گی وہ میں بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ میں آئندہ بھی یہی کروں گا اور روپے کی خاطر کسی کا گھر نہیں ٹوٹنے دوں گا۔ اس لئے میں اس مجلس منتظمہ سے استعفیٰ پیش کرتا ہوں۔ میری بات پر حسین بھائی اور دوسرے جو دو تین افراد تھے بالکل چپ ہو گئے اور مجھ سے معاملہ رفع دفع کرنے کی درخواست کرنے لگے۔

میں اپنے منصب سیکریٹری کے دوران باقاعدگی سے اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ روزانہ رات کو تین چار گھنٹے جماعت کے دفتر میں حاضر رہتا، فریقین کی فریاد سنتا اور فیصلے کرتا۔ آپ اس زمانے کی رپورٹ بک دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ 12 یا 14 طلاق یا منگنی شکنی کے مقدمات ہوں گے۔ لیکن ناراضگی پر بضد رہنے کا کوئی مقدمہ شاید ہی ملے گا۔ یہ ایک نیا میلان و رجحان تھا۔

مجھے جماعت کو خیر باد کہنے کا دکھ ہوا تو وہ صرف اسی بات کا ہوا کہ جماعت کے منصب کے ساتھ ساتھ نیکی کا ایک کام بھی مجھ سے چھوٹ گیا۔ میرا دل اس کے لئے کبھی کبھی مجھے ملامت بھی کرتا کہ یہ کام کیوں چھوڑ دیا، لیکن خیر ۔۔۔ آج بھی جماعت کے ذریعے سال بھر میں دو تین ناراضگی پر مصر رہنے کے مقدمات میرے پاس آتے ہیں جن کے فیصلے میں اپنے آفس میں ہی بیٹھ کر کر دیتا ہوں۔

میں جماعت میں نوجوانوں کو لانا چاہتا تھا۔ اصلاحی انجمن والے چار پانچ نوجوان منتخب بھی ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اب تو آپ جماعت میں آ گئے ہیں، اب کیوں کچھ نہیں کرتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم چار پانچ افراد کیا کر سکتے ہیں؟ جماعت کی مجلس منتظمہ کا انتخاب تو سپریم باڈی کرتی ہے اور اس طرح وہ لوگ اپنی اکثریت قائم کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ہم بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں، آپ اس کا کوئی علاج کریں۔

اس پر بھائی عمر اے رحمٰن نے سب کو جمع کیا۔ میرے بنگلے میں دس بارہ افراد کا اجلاس ہوا۔ مجموعی طور پر 50 افراد کو منتخب کرنے کے لئے جماعت میں ریکوزیشن داخل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میں نے پیر محمد کالیا اور ابا عمر دادا سے کہا کہ تم کنوینر بنو۔ لیکن وہ دونوں نہ مانے اور کہا کہ ہم اس طرح ریکوزیشن نہیں کرنا چاہتے، آپ کنوینر بن جائیں۔ میں نے شرط رکھی کہ جماعت میں شرکت نہیں کروں گا اور آپ ایسے ضابطہ قوانین تشکیل دیجئے گا جن پر پورا عمل ہو سکے۔ انہوں نے یہ شرائط منظور کر لیں۔ اس لئے ریکوزیشن پر دستخط لے کر اسے جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔

اس کے بعد حلقہ مصالحت سرگرم ہوئے۔ عبدل سیٹھ کے بنگلے میں جماعت کے عہدہ داروں کی میٹنگ ہوئی۔ میں نے کہا، مصالحت کے لئے ضروری ہے کہ آپ ڈائرکٹ الیکشن کے لئے متفق ہو جائیں چاہے سپریم باڈی گیارہ افراد ہی منتخب کرے۔ لیکن وہ لوگ نہ مانے۔

پھر بھائی پیر محمد کالیا کے آفس میں نوجوانوں کا اجلاس ہوا۔ میں بھی اس میں شامل ہوا۔ نوجوانوں کی تقریروں سے میں بے حد متاثر ہوا۔ مسٹر مرحوم خانانی نے کہا کہ ہم قسم کھا کر وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے حکم پر اپنا لہو بہا دیں گے۔ میں نے اپنی جوابی تقریر میں کہا اس کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ضرورت ہوئی تو سب سے پہلے میرا لہو بہے گا۔ اس لئے یہ ساری باتیں چھوڑیں اور ایک نکتہ پر آئیں کہ اجلاس میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں۔ اس کے لئے لوگوں کو ترغیب دیں تاکہ ریکوزیشن منظور کرانے میں آسانی ہو۔ میری بات پر سب نے بیک آواز لبیک کہا۔

جماعت کے عہدہ داروں کو اس بات کی خبر پہنچی تو وہ میرے اردگرد گھومنے اور مجھ سے مصالحت کے لئے درخواست کرنے لگے۔ پھر ہم نے اپنے عالمگیر روڈ کے اجلاس میں 25 افراد کے انتخاب کے لئے منظوری دے دی۔ لیکن پھر میرے خلاف بیانات اور مراسلات کا آغاز کر دیا گیا اور مجھ پر اس قسم کے الزامات عائد کئے گئے کہ میں

عکسِ باٹوا

اپنی سیکریٹری شپ اور سپریم باڈی کی سیٹ کے لئے جمہوریت کے نام سے تماشے کر رہا ہوں جبکہ میری سیکریٹری شپ کے تحت ان اداروں مثلاً ایجوکیشنل بورڈ، بانٹوا انجمن اور بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی میں تو جمہوریت کا نام ونشان تک نہیں ہے۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے متعدد الزامات کا کیچڑ مجھ پر اچھالا گیا۔لیکن میں ثابت قدم رہا۔اللہ عزوجل کے فضل وکرم سے ایک دفعہ فیصلہ کر لینے کے بعد کیسے ہی دگرگوں حالات ہوں، مجھے اپنے فیصلے پر قائم رہنے کی عادت ہے۔لیکن مجھے جماعت کی عزت ووقار کا بھی خیال تھا۔اس لئے مصالحت کرنا ضروری تھا آخر کار اس شرط پر مصالحت ہوئی کہ 21 افراد کے انتخابات نئے سرے سے ہوں گے، اس مطلب کی آئین میں اصلاح کی جائے۔

جماعت نے اس شرط کے مطابق آئین میں اصلاح کی تو ہمارے جوان اکثریت سے منتخب ہو گئے۔مجھ سے اصرار کیا گیا کہ میں جماعت میں کوئی عہدہ سنبھالوں۔لیکن میں نے تو پہلے ہی سے شرط عائد کی تھی کہ میں کوئی عہدہ نہیں لوں گا۔ان کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔یہاں تک کہ ولی محمد حاجی دادا 125 دستخطوں والا کاغذ لے کر میرے پاس آئے جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے جس میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ آپ اور آپ کے آباؤ اجداد نے جماعت کی بے حد خدمت کی ہے اس لئے آپ ہی جماعت کے سیکریٹری بنیں۔لیکن میں نے ان کا یہ اصرار بھی شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔

جماعت میں نئی نسل کے جوانوں کو لے آنے کا میرا مقصد اس طرح پورا تو ہو گیا۔لیکن میں ان کی کارکردگی سے مطمئن نہ ہوا۔میں بھائی پیر محمد کالیا اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ بحث مباحث کرتا رہا اور کہتا رہا کہ آپ کی کارکردگی تسلی بخش نہیں ہے۔بھائی پیر محمد سیکریٹری تھے لیکن بہت ساری جماعتوں میں حصہ لینے کا ذوق وشوق ہونے کی وجہ سے وہ بانٹوا جماعت پر پوری توجہ نہ دے پاتے تھے۔اس لئے جہیز یا دوسری بری رسوم کے خلاف قواعد وضوابط تشکیل نہ پاتے تھے اور فیصلے بھی درست نہ ہوتے تھے۔گروہ بندی سے قواعد وضوابط یا فیصلے درست طور پر ہو ہی نہیں سکتے۔

علاوہ ازیں میں نے بھائی حاجی شکور بلوانی سے بھی کہا۔حاجی شکور بلوانی ذاتی طور پر خدمت معاشرہ کا شوق رکھتے تھے۔وہ مالی مدد بھی عطا کر سکتے تھے۔لیکن وقت مہیا نہیں کر سکتے تھے۔انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ

آئیں تو میں نے انکار کر دیا کہ میں نہیں آسکتا۔

ایک بات کا مجھے بہت دکھ ہے کہ ہم ہمیشہ امیر الامرا اور سیٹھوں کو ہی عہدے دیتے ہیں جو جماعت میں بھی نہیں آتے اور اجلاسوں میں بھی حاضر نہیں رہتے۔ مخصوص عہدے ایسے لوگوں کو بھی دیے جانے چاہئیں جو خواہ دولت مند نہ ہوں لیکن لائق اور عمدہ ورکر ہوں۔ جماعت یا کسی بھی ادارے کی کامیابی کا دارومدار اس کے سیکریٹری کی سرگرمیوں پر ہوتا ہے۔ سیکریٹری ایسا آدمی ہونا چاہیے جو فریقین کو مرعوب و مطمئن کر سکے، اقتصادی طور پر وہ مستحکم ہو اور قوم اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتی ہو یعنی وہ عزت دار شخصیت کا حامل ہو۔ اسی لئے میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کو آگے لایا جائے۔ کیونکہ ایسے لوگ اپنے آپ کو شاذ و نادر ہی آگے لاتے ہیں۔

بھائی حسین دھامیا بانٹوا کے زمانے سے جماعت کے خدمت گزار رہے ہیں اور وہ آج بھی حسب طاقت و توانائی جماعت کی خدمت کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمیں ان کی عزت و احترام برقرار رکھنا چاہیے۔ جب تک ایسے لوگوں کا احترام نہ کیا جائے اور ان کی شخصیت کے مطابق انہیں عزت نہ دی جائے اس وقت تک جماعت میں اچھے آدمی کا آنا مشکل نظر آتا ہے۔

بانٹوا جماعت میں شامل ہونے والی نئی نسل نے بھی کئی عمدہ کام کئے ہیں۔ وہ شادی مد و فنڈ اکٹھا کر کے شادی کے لئے امداد فراہم کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ناظم آباد میں نئی آبادی قائم کی ہے لیکن ان کے دوسرے کام اطمینان بخش نہیں ہیں۔

حاجی عیسیٰ ڈنڈیا اور بھائی صدیق پولانی نے جماعت سے میرے استعفاء دینے کے بعد مجھے ایک خط میں لکھا کہ ''آپ نے جمہوریت کے علم بردار کا روپ دھار کر جماعت کو ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیا ہے کہ قوم آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہ آپ نے بڑا گناہ کیا ہے۔''

یہ خط آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ میں مانتا ہوں کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ انہوں نے بھی خطائیں کی ہیں، میں بھی خطا کار ہوں۔ لیکن انسان کی نیت نیک ہونی چاہیے۔ میں نے سارے کام نیک نیتی سے کئے ہیں، جس میں اللہ کی رضا بھی شامل تھی۔ میں بہت کچھ تحریر کرنا چاہتا ہوں پھر بھی زیادہ تحریر نہیں کرتا۔ انسان ہر ایک کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات کسی کو ناراض بھی کرنا پڑتا ہے، یہ ایک قدرتی بات ہے۔

بہر حال جماعت کے عہدہ داروں سے میری ایک ہی اپیل ہے کہ گروہ بندی سے دور رہیں، یہی سب کے لئے بہتر ہے۔

☛ ☛ ☛

عکسِ بانٹوا

کراچی میں بانٹوا میمن کمیونٹی کے دیگر ادارے

ہم نے گزشتہ صفحات میں کراچی میں کام کرنے والے ایسے اداروں کا مطالعہ کیا ہے جو ہجرت سے پہلے بانٹوا میں عملاً موجود اور فعال تھے۔ کراچی میں آنے کے بعد بانٹوا سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اس کے علاوہ بھی دیگر شعبوں کی سرگرمیوں کے لئے بھی کافی کام کیا۔ یہ سرگرمیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ہاؤسنگ ۲۔بک بینک ۳۔بے روزگاری کا خاتمہ

۴۔چھوٹے قرضے کی اسکیمیں ۵۔شادی مددی اسکیمیں ۶۔یتیم خانے

۷۔اسکول ۸۔کالج ۹۔انڈسٹریل ہوم وغیرہ

مندرجہ بالا سرگرمیوں کو پروان چڑھانے کے لئے کئی نئے ادارے قائم کئے گئے جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

1۔بانٹوا میمن کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی 2۔بانٹوا میمن ملٹی پرپز سوسائٹی

3۔ بانٹوا اسٹوڈنٹ یونین 4۔بانٹوا اسٹڈی سینٹر

5۔بانٹوا ولنٹیئر کور 6۔بانٹوا اناؤن کمیٹی

7۔بانٹوا اصلاحی انجمن 8۔بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی

9۔الجیلانی فاؤنڈیشن 10۔صفورا بائی میمن گرلز بورڈنگ ہاؤس

11۔حسینی یتیم خانہ 12۔رونق اسلام گرلز اسکول اور کالج

13۔میمن ایجوکیشنل بورڈ 14۔عائشہ حاجیانی لوائی ٹرسٹ

ایک خاص بات کا ذکر کرتا چلوں کہ "بانٹوا میمن کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی" بانٹوا جماعت نے قائم کی تھی۔

اس نے ابھی حال ہی میں بانٹوا نگر میں ایک نجی اراضی خرید کر بانٹوا کے 500 باشندوں کے قیام کا انتظام کیا ہے۔ یہ

عکسِ بانٹوا

ایک قابل تعریف کام ہے۔اسکیم نمبر 33 میں بھی 60 ایکڑ اراضی حاصل ہوئی ہے۔

جیلانی کوآپریٹو سوسائٹی میں نے قائم کی تھی لیکن اسے اراضی حاصل نہ ہوسکی۔اس کے لئے میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ میری کوتاہی تھی کہ میں نے اس پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی تھی۔دراصل اس وقت مجھے محسوس ہوا تھا کہ اراضی کی قیمت زیادہ ہے جو مجھے 100 سے 150 روپے فی گز پڑے گی اور رہائش شروع ہوتے ہوتے پچیس تیس سال لگ جائیں گے۔

لیکن تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ اراضی لینے والے اراکین اپنی رہائش کے لئے اراضیاں نہیں لیتے بلکہ تجارت کے لئے لیتے ہیں۔اس طرح مجموعی آبادی واقامت کا اصل مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔میری عاجزانہ گزارش ہے کہ جن لوگوں کے پاس ان کا اپنا مکان نہ ہو،صرف انہیں وہاں آباد کرنا چاہیے اور انہیں ہر قسم کی سہولت فراہم کرنی چاہیے۔ایسا کرکے ہی آبادی واقامت کا مقصد پوری طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بانٹوا اسٹوڈنٹ یونین

اس یونین کی بنیاد بانٹوا کے باشندوں نے ڈالی تھی۔انہیں بانٹوا جماعت نے جگہ حاصل کرنے کے لئے قرضہ دیا تھا۔اس وقت میں جماعت کا سیکریٹری تھا۔اس یونین کے ذریعے میمن طلباء کو بے حد فائدہ ہوتا ہے۔اس قسم کی کوئی سرگرمی پہلے بانٹوا میں موجود نہ تھی۔

بانٹوا میمن والنٹیئر کور

بانٹوا میمن والنٹیئر کور بھی درحقیقت کراچی میں قائم کیا جانے والا ایک ادارہ ہے۔یہ ادارہ بانٹوا میں نہیں تھا۔ہجرت کے چند سالوں بعد 1952ء میں مولانا عبدالستار ایدھی نے اس ادارے کی بنیاد ڈالی تھی۔اس کے بعد اس ادارے کے متعدد نام تبدیل کیے گئے۔مولانا عبدالستار ایدھی بلاشبہ قابل تعریف کام کرتے ہیں۔

بانٹوا اصلاحی انجمن

بانٹوا اصلاحی انجمن بھائی پیر محمد کالیا نے دوسروں کے تعاون سے شروع کی تھی۔اس انجمن کا مقصد بانٹوا

جماعت کے ضابطوں پر عمل درآمد کراتا اور پگڑی سسٹم کو مکمل طور پر ختم کرتا تھا۔ لیکن میرے خیال میں انجمن اپنے مقصد میں ناکام رہی۔

فیڈرل بی ایریا میں بھی بانٹوا کا ایک ادارہ کام کر رہا ہے۔ اگرچہ اس کی کارگزاری اس علاقے تک ہی محدود ہے۔ لیکن یہ شادی مدد جیسے بڑے کام بھی کرتا ہے۔ اس ادارے میں بھائی غفار گاگائی اچھی محنت کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ چند پاکٹ ادارے بھی ہیں جن کو کبھی کبھی بوقت ضرورت استعمال کرلیا جاتا ہے۔

مجھے ایک بات کی بے حد خوشی ہے کہ اب اداروں اور جماعتوں پر سیٹھوں کا غلبہ نہیں رہا۔ پہلے ہمارے دماغوں میں یہ ٹھُس گیا تھا کہ ہم سیٹھ صاحبان کے بغیر نہیں چل سکیں گے۔ لیکن اب یہ اعتقاد نہیں رہا۔ میں اور بھائی سلیمان بھورا ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ کام چاہے کم ہو لیکن سیٹھوں کے پیچھے نہ بھاگیں۔ سیٹھ صاحبان خود ہی آپ کا کام دیکھ کر آپ کے پاس آئیں گے اور فنڈ بھی دیں گے، کام میں دلچسپی بھی لیں گے۔ ہمارے یہ خواب اب شرمندۂ تعبیر ہو رہے ہیں اس لئے میں بے حد اطمینان اور تسکین محسوس کر رہا ہوں۔

بانٹوا نگر میں بانٹوا نگر کا اپنا ادارہ قائم ہوا ہے جو ایک دواخانہ چلا رہا ہے اور بانٹوا نگر کے مکینوں کی دوسری خدمات بھی انجام دے رہا ہے۔ واقعی یہ ایک اچھی بات ہے۔

عکسِ بانٹوا

بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی

میں نے بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی تھی۔اس میں بھائی عمر اے رحمٰن نے عمدہ تعاون کیا۔اس ادارے کو قائم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کی ایک قرار داد کے مطابق پچپن ساٹھ فیصد سے کم نمبر حاصل کرنے والے طلباء کو اسکالرشپ دینے سے انکار کیا جاتا تھا۔

مجھے اسکول چلانے اور طلباء کے بارے میں تجربہ تھا۔اس وقت میں بانٹوا جماعت کا سیکریٹری تھا اور میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے قانون کے مطابق طلباء کے اسکالرشپ فارم پر مجھے بھی دستخط کرنا پڑتے تھے۔لیکن متعدد طلباء کافی نمبر حاصل نہ کرنے کے سبب فارم پر جمع نہیں کرا سکتے تھے اس لئے میں اپنے فنڈ سے ایسے طلباء کو رقم فراہم کر دیتا تھا۔لیکن سیکریٹری شپ چھوڑنے کے بعد طلباء کو تکلیف ہونے لگی۔چنانچہ اس مقصد اور طلباء کی تکلیف کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے درج بالا ادارہ (بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی) قائم کیا تا کہ بانٹوا کا جو طالب علم میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی سے اسکالرشپ حاصل نہ کر سکے اسے اس ادارے سے امداد دی جائے۔اس کے لئے میں نے اس ادارے میں نوجوانوں کو شامل کیا تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنے بیٹے حسین کی شادی کی خوشی میں بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی کو اس شرط پر ایک معقول رقم دی تھی کہ ہر سال بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جانے والے طلباء میں سے تمام غریب طلباء کو دو دو ہزار روپے دیے جائیں۔لیکن ایسے طلباء کی تعداد زیادہ تھی اس لئے رقم ختم ہو جانے کے باعث یہ اسکیم بند کر دی گئی۔اس وقت ایک طالب علم سات ہزار روپے میں امریکا جا سکتا تھا جس کے لئے دو ہزار روپے سوسائٹی دیتی اور دو ہزار روپے ملٹی پرپز سے ملتے جس کا اس وقت میں سیکریٹری تھا۔بقیہ رقم کا انتظام طالب علم خود کر لیتا تھا۔حصول تعلیم کے لئے بیرون ملک جانے والے طلباء کی امداد بند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اتنی رقم سے کراچی میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی کثیر تعداد کو امداد دی جا سکتی تھی۔مجھے خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے طے کردہ نمبروں تک پہنچنا طلباء کے لئے آسان نہیں۔اگر چہ بعد میں اس سوسائٹی نے بھی طے کردہ نمبر

حاصل کرنے کی شرط نرم کردی تھی۔لیکن بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی بھی اسکول فیس، یونیفارم اور کتابوں وغیرہ کی امداد مہیا کرتی تھی اور کام بھی قابل تعریف ہو رہا تھا۔

صفورا بائی میمن گرلز بورڈنگ ہاؤس

میمن ایجوکیشنل بورڈ بھی بانٹوا کے میمنوں نے قائم کیا تھا۔اس بورڈ کی تحویل میں آٹھ اسکول تھے جن میں 5000 طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔میں اس وقت بورڈ کا سیکریٹری بھی تھا اور بانٹوا جماعت کا بھی۔ایک مرتبہ میں فنڈ حاصل کرنے کے لئے مرحوم حاجی عمر ٹی کے پاس گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگے کہ میرا کسی بڑے کام میں بڑی رقم دینے کا ارادہ ہے،اس کے لئے میری رہنمائی فرمائیں۔

میں نے کہا۔''دیکھیں جناب!لڑکوں کے لئے تو ایک یتیم خانہ ہے مگر میمن لڑکیوں کے لئے کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔میں نے ایک ایسا خاندان دیکھا ہے جس کا سربراہ تو ایک بانٹوا باسی میمن تھا لیکن اس کی بیوی میمن نہ تھی۔ وہ سربراہ میمن تو ہارٹ فیل ہونے سے فوت ہو گیا تھا۔مگر اس کی چھ بیٹیاں تھی اور ایک اولاد اس کی بیوہ کے پیٹ میں پرورش پا رہی تھی۔یہ ساتویں اولاد بھی بیٹی ہی پیدا ہوئی اور ماں کے ساتھ نومولود بچی بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔زندہ بچیوں میں سب سے بڑی بیٹی تیرہ چودہ سال کی ہے۔مرنے والی عورت کا اس دنیا میں کوئی نہیں،صرف مرحوم شوہر کی ایک خالہ ہے،وہ بھی عمر رسیدہ ہے۔اس نے یتیم بچیوں کے قیام کا انتظام تو کیا ہے،لیکن حاجی صاحب اگر لڑکیوں کے لئے ایک یتیم خانہ ہو تو ایسی دشواریاں پیدا نہ ہوں۔مذکورہ خاندان کی حالت دیکھنے کے بعد میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے پھر بھی لڑکیوں کے لئے ایک یتیم خانہ انشاءاللہ ضرور قائم کروں گا۔یوں تو کرائے کے مکان میں بھی یتیم خانہ چل سکتا ہے اور چلتا رہے گا۔اس کے لئے درکار فنڈ بھی ملتا رہے گا لیکن اگر جگہ اپنی ہو اور فنڈ مہیا کرنے والا آدمی بھی ایک ہی ہو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔''

حاجی عمر ٹی نے میری بات سن کر مجھ سے پوچھا کہ ایک ہی آدمی پوری رقم فراہم کرے تب ہی ایسا کام کیا جا سکتا ہے؟ میں نے جواباً کہا کہ میرا دل تو یہی کہتا ہے۔حاجی عمر ٹی نے حاجی قاسم لمبا کو طلب کیا اور ایک مرتبہ پھر

سارا احوال میری ہی زبانی کہلوایا۔پھر مجھ سے پوچھا کہ جگہ کے لئے کیا کریں گے؟

میں نے کہا۔"جگہ بھی دستیاب ہے جو بالکل تیار ہے۔اسحاق دلال کے ذریعے میں نے ایک بنگلہ دیکھ رکھا ہے۔مالک دولاکھ روپے مانگ رہا ہے اور ہم پونے دو لاکھ پر اڑے ہوئے ہیں۔"

بات یہاں پر ختم ہوگئی۔حاجی عمر نے کہا کہ ہم سوچیں گے،آپ پھر آیئے گا۔

اتفاق سے مجھے ان کے پاس جانا یاد نہ رہا۔لیکن شام کو پانچ بجے ان کا فون آیا کہ آپ آئے نہیں؟ میں نے معذرت کی کہ میں تو بھول گیا،آپ کہیں تو ابھی گاڑی میں آجاؤں؟انہوں نے جواب میں کہا کہ ہاں،آجائیں۔

بہر حال ہم نے جا کر بنگلہ دیکھ لیا۔ہمارے ہمراہ ان کے دو تین آدمی اور بھی تھے۔سب نے کہا کہ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔حاجی عمر ٹی تین شرائط پر تیار ہو گئے۔

۱۔ بنگلہ کی قیمت تو وہ خود ہی ادا کریں گے۔پھر میں چاہوں تو اپنے نام سے ٹرسٹ بناؤں یا پھر جیسے میں مناسب سمجھوں ویسے کروں۔

۲۔ رقم عطا کرنے کے بعد حاجی عمر اس کام میں شریک نہیں ہوں گے اور مزید رقم بھی نہیں دیں گے۔میں خود جب تک بہ قید حیات (زندہ) رہوں یتیم خانہ کو چلاتا رہوں۔

۳۔ یتیم خانہ یا بورڈنگ ہاؤس جو کچھ بھی ہو،اسے حاجی عمر کی والدہ صفورا کے نام سے قائم کیا جائے۔

میں نے یہ تینوں شرائط قبول کرلیں۔پھر جیسے تیسے کر کے ایک لاکھ نوے ہزار روپے میں جگہ کا سودا طے کیا۔کل جگہ 2300 گز تھی۔کارنر کا بنگلہ تھا اور اس کے الگ الگ دو گیٹ تھے۔ہم نے چند دن میں پوری رقم ادا کر کے قبضہ لیا اور رجسٹریشن بھی کرالیا۔

ویسے تو یہ سب کچھ میری ذمہ داری پر ہوا تھا۔لیکن اب کیا کروں؟ یتیم خانہ کیسے شروع کیا جائے؟اس کے لئے میں نے صدر کی حیثیت سے بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی کا اجلاس طلب کیا۔عہدہ داروں کو ساری تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ بلڈنگ خرید لی گئی ہے،اب ہمیں لڑکیوں کے لئے بورڈنگ ہاؤس یا یتیم خانہ شروع کرنا ہے۔

سب لوگ کہنے لگے کہ لڑکیوں کی ہم ذمہ داری نہیں لے سکتے، آپ کوئی عمر رسیدہ آدمی تلاش کریں اور ٹرسٹ بنالیں۔ میں نے جواباً کہا کہ میں کسی کو تلاش نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی کوئی نیا ٹرسٹ یا ادارہ بنانا چاہتا ہوں۔ آپ فکر میں مبتلا نہ ہوں۔ سارا کام میں ہی کروں گا۔ میں تو اپنے قائم کئے ہوئے ادارے کو یہ کام سپرد کرنا چاہتا ہوں۔

پھر انہوں نے فنڈ کا سوال کھڑا کیا کہ فنڈ کہاں سے آئے گا؟ میں نے جواب دیا کہ ابھی تک اس ادارے کے فنڈ کی ذمہ داری میں ہی اٹھا رہا ہوں اور بورڈنگ ہاؤس یا یتیم خانہ کے فنڈ کی ذمہ داری بھی میں ہی سنبھال لوں گا۔ چنانچہ وہ لوگ مان گئے۔ لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ بنگلہ کا ایک حصہ حکومت کی پالیسی کے سبب حکومت سندھ سے ریکوزیشن ہوگیا جس کو دوبارہ اپنی تحویل میں لینے کی ذمہ داری نہ حاجی عمر ٹی کی تھی نہ ہی سوسائٹی کی تھی۔ یہ ذمہ داری تو میری اپنی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ سال کی تگ ودو کے بعد ہم نے بنگلہ اپنی تحویل میں واپس لے لیا اور ایک عظیم الشان تقریب کا اہتمام کر کے بھائی حاجی حسین پاریکھ کے دست مبارک سے اس کا افتتاح کرایا۔ اس تقریب میں لوگوں کی بھاری تعداد نے شرکت کی تھی۔ اس کی فلم بھی بنائی گئی تھی۔ لیکن لڑکیوں کا داخلہ رسم افتتاح سے پہلے ہی شروع کر دیا گیا تھا۔

یہ یتیم خانہ میمن قوم کے لئے ایک نئی بات تھی۔ اس لئے لوگ لڑکیوں کو اس یتیم خانے میں داخل کروانے سے کتراتے تھے۔ میں نے تو اسٹاف بھی رکھ لیا تھا۔ لیکن لڑکیاں کم تھیں اور اخراجات زیادہ تھے۔ پہلے پہل اس میں بیس اکیس لڑکیاں تھیں جو بڑھ کر 50 ہوگئیں۔

لڑکیوں کو اسکول کے علاوہ ٹیوشن کی سہولت بھی فراہم کی گئی ہے۔ اسکول سے روزانہ تین ٹیچرز آتی ہیں اور تین گھنٹے ٹیوشن پڑھاتی ہیں۔ اس میں سلائی کڑھائی سکھائی جاتی ہے۔ کھیل کود اور ٹیلی وژن سمیت تفریح کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کے لئے گاڑی کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی جاتی ہے۔ ایک لڑکی کی تعلیم پر 500 روپے خرچ ہوتے ہیں۔ امتحانات کے نتائج اللہ عزوجل کے فضل وکرم سے شاندار آتے ہیں۔

اب تک اس بورڈنگ ہاؤس کی 21 لڑکیوں نے میٹرک پاس کرلیا ہے۔ دوسری تین لڑکیاں اس سال

میٹرک کا امتحان دینے والی ہیں۔ 14 لڑکیوں کی شادی کے اخراجات بورڈنگ ہاؤس نے برداشت کئے ہیں۔ میٹرک کے بعد لڑکی کو اس کے وارث کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ آج کل ایک لڑکی پر سالانہ چھ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ ادارے کا نام یتیم خانہ کی بجائے بورڈنگ ہاؤس اس لئے رکھا گیا ہے تا کہ لڑکیوں کو اپنی یتیمی کا احساس نہ ہو۔ اسی لئے فنڈ میں بھی نقد رقم کے سوا ہم کچھ نہیں لیتے کہ لڑکیوں کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ یتیم ہیں۔ اس کے علاوہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے والی لڑکیوں کو انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔ سلائی کڑھائی، گھریلو کام کاج، کھانا پکانا سب کچھ سکھایا جاتا ہے۔ نماز اور دینی تعلیم لازمی ہے۔ دینی تعلیم کے لئے خاص طور پر ایک معلّمہ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی میں زیادہ تر جوان ممبر تھے۔ اس لئے میں نے بورڈنگ ہاؤس کو چلانے کے لئے 40 سال یا اس سے زیادہ عمر کے معزز اور نیک سیرت لوگوں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ لیکن وہ لوگ بورڈنگ ہاؤس کے انتظام انصرام میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے اور کبھی دلچسپی لیتے تو بھی کسی خاص کارکردگی کا مظاہرہ نہ کرتے تھے۔ اس لئے شروع کے تقریباً اڑھائی تین سالوں تک بورڈنگ ہاؤس کی تمام ذمہ داریاں میرے سپرد رہیں۔

اس کے بعد میں نے دوبارہ سوسائٹی کے 40 سال سے زائد عمر کے ممبران کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں چند مستعد اور کام کرنے والے افراد تھے۔ عمر اے ڈی کریم بڑی عمدگی سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس کمیٹی میں حاجی شکور بلوانی کو بھی لیا گیا تھا۔ وہ تعطیل کے روز یعنی جمعہ کو ایک گھنٹہ کے لئے آتے تھے۔ اس طرح صلاح ومشورے اور ٹیم ورک سے کام ہوتا رہتا تھا۔

میں، میری بیوی اور بہو فرزانہ قاسم بھی روزانہ چار گھنٹے بورڈنگ ہاؤس میں حاضری دیتے۔ جب تک میری بیٹیوں کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ بورڈنگ ہاؤس میں بچیوں کو تعلیم دیتی تھیں۔ ان کی شادی ہو جانے کے بعد تعلیم وٹیوشن کے لئے معلماؤں کی خدمات حاصل کی گئیں۔

بعد میں دونوں بنگلوں پر مزید ایک ایک منزل تعمیر کرانے کا منصوبہ بنایا گیا تو سارے اراکین تشویش میں مبتلا ہو گئے کہ دس لاکھ کا بجٹ ہے، یہ کس طرح مکمل ہو سکے گا۔ میں نے کہا کہ یہ اللہ عزوجل کا کام ہے، پہلے بھی آپ لوگوں سے کہہ چکا ہوں کہ آپ لوگوں کو روپے کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کام شروع کریں، اللہ عزوجل چاہے گا تو

روپیہ خود بخود آجائے گا۔اس کے بعد بھائی غفار نوٹنکیا کو پرانے ہوجانے والے بنگلوں کی مرمت اوران سے منسلک دواور چھوٹے بنگلوں کے لئے پلان تیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔پلان پاس ہوگیا تو میں فنڈ کے لئے قوم کے سخی داتاؤں کے پاس گیا۔میرے ساتھ بہت عمدہ تعاون کیا گیا۔ہمارے خاندان نے کسی نام کے بغیر ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا اور دو لاکھ روپے کا Loan ملا۔یوں فنڈ مکمل ہوگیا۔بنگلوں پر منزلیں بڑھانے سے اب وہاں 80 لڑکیوں کی گنجائش ہوگئی۔ساتھ والے بنگلے کرایہ پر دینے سے ستر پچھتر ہزار کی آمدنی ہونے لگی۔لون (Loan) بھی ادا کردیا گیا۔آج ان بنگلوں کی قیمت کروڑوں میں ہے اور سوسائٹی ایک مستحکم ادارہ بن گیا ہے۔

کچھ عرصے بعد بھائی اے ڈی کریم نے اپنی نجی مصروفیات کی وجہ سے استعفادے دیا۔مجھے ان کے استعفا سے دکھ ہوا۔کیونکہ انہوں نے ایک مستعد اور عمدہ کارکن کے طور پر پوری ایمانداری سے ادارے کو اپنی خدمات پیش کی تھیں۔حقیقتاً میں ان کا استعفا منظور کرنے کو تیار نہ تھا۔لیکن انہوں نے بے حد اصرار کر کے استعفیٰ منظور کرالیا۔ان کے استعفیٰ دینے کے بعد چھ سات ماہ تک مجھے ہی ساری ذمہ داریاں نبھانا پڑیں۔کیونکہ جوائنٹ سیکریٹری بھائی غفار نوٹنکیا بھی ادارے پر پوری توجہ نہیں دے رہے تھے۔

آخر کار میں نے حاجی عیسیٰ ڈنڈیا سے بات کی تو انہوں نے بطور سیکریٹری ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ان کی وجہ سے مجھ پر کام کا بوجھ چالیس پچاس فیصد کم ہوگیا۔میں ہمیشہ ایسے اداروں کے لئے اچھے اور نیک دل کارکنوں کا انتخاب کرنے کے لئے اصرار کرتا ہوں۔لیکن ایسے لوگوں کو تلاش کرنا ایک مشکل کام ہے۔حقیقت میں اس قسم کے سرگرم رہنے والے کارکنوں کی فنڈ اور زکوٰۃ صدقات عطا کرنے والوں سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔

ایک دفعہ مرحوم حاجی شکور بلوانی نے مجھے کہا کہ ہم اور ہمارے خاندان کے لوگ کچھ روپے خرچ کرنا چاہتے ہیں۔آپ کوئی راستہ بتائیں۔میں نے جواب میں ان سے بانٹوا نگر میں ایک اسکول قائم کرنے کے منصوبے کا ذکر کیا۔چنانچہ وہ وہاں جا کر اراضی دیکھ آئے اور خاندان کے اراکین سے ضروری صلاح مشورہ کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ بھائی منصوبہ تو بہت عمدہ ہے۔لیکن یہ اسکول آپ ہی بنائیں اور آپ ہی چلائیں۔

میں نے انکار کر دیا مگر انہوں نے اصرار جاری رکھا۔انہوں نے بانٹوا کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی سے مذاکرات جاری رکھے۔لیکن وہاں اپنا نام نہ دیا۔میں نے ان سے بہت کہا کہ آپ خود کوئی ادارہ یا کوآپریٹو سوسائٹی

قائم کر کے اسے خود ہی چلائیں، آپ کے خاندان میں بہت سے لوگ ہیں ان کا تعاون حاصل کریں۔لیکن وہ کہتے رہے کہ نہیں، آپ کو اسکولوں کے انتظام وانصرام اور دوسرے تمام امور کا تجربہ ہے اور آپ کے ماہرانہ انتظامات سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں، اس لئے اسکول آپ ہی چلائیں۔

آخر کار اراضی سے متعلق سوسائٹی کے ساتھ ان کے مذاکرات ناکام ہو گئے۔بھائی ہارون چاڈیا اور بھائی غفار نوٹنکیا نے بھی ان کے لئے کوششیں کیں مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔اس لئے حاجی شکور بلوائی نے میرے ساتھ بالکل فائنل بات کر لی کہ بھائی ہم سے کچھ نہیں ہو سکے گا، آپ ہی سوسائٹی سے مل کر کوئی راستہ نکالیں۔اس پر میں نے بھائی پیر محمد کالیا کو طلب کیا۔وہ بھائی حسین دھامیا کے ہمراہ آئے۔ہم نے فوری طور پر شرائط طے کیں اور اسی نشست میں ہی سب کچھ طے کر لیا۔

لیکن اس کے بعد چند ہی دنوں میں بھائی حاجی شکور بلوائی اللہ عزوجل کو پیارے ہو گئے۔میں نے ان کے خاندان کے دوسرے اراکین حاجی شریف اور پیر محمد دیوان سے بات کی تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں معلوم ہے، آپ بے فکر ہو کر کام آگے بڑھائیں۔اب سوسائٹی کی جانب سے الاٹمنٹ لیٹر آ گیا ہے اور اس کے روپے ادا کر دیے گئے ہیں۔نقشہ پاس ہوتے ہی تعمیر کا کام شروع کر دینا ہے۔

الجیلانی فاؤنڈیشن

اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور فضل وکرم سے الجیلانی فاؤنڈیشن بھی رجسٹرڈ ہوگئی ہے۔اس کے ابتدائی پروجیکٹ نے ''رقیہ حاجیانی ہائی اسکول'' کے نام سے بانٹوا نگر میں کام کرنا شروع کردیا ہے۔سادگی سے پر ایک تقریب میں محترمہ رقیہ حاجیانی نے اس پروجیکٹ کا سنگ بنیاد رکھنے کی رسم ادا کی تھی۔اگرچہ ٹھیکیدار درست نہ ہونے کی وجہ سے اس پروجیکٹ کو مکمل کرنے میں آٹھ ماہ سے زیادہ عرصہ لگ گیا بہر حال اللہ عزوجل کے فضل وکرم سے کام برابر چل رہا ہے۔

اس اسکول میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے دو الگ الگ شفٹیں چل رہی ہیں۔دونوں شفٹوں میں کے جی سے میٹرک تک کی گنجائش ہے۔اس کے علاوہ عربی کی تعلیم اور جسمانی ورزشوں کی بھی مکمل سہولتیں فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ٹریفک قوانین کی بھی ضروری تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔اسکول کے لئے تربیت یافتہ اور تجربہ کار اسٹاف پسند کیا گیا ہے۔ابھی چار پانچ جماعت تک آغاز کیا گیا ہے لیکن آگے چل کر مکمل طور پر ایک اسکول کام کرنے لگے گا۔

اس اسکول کے لئے تقریباً 90 فیصد اقتصادی تعاون حاجی غنی دیوان اور حاجی نعیم بلوانی کے ورثاء اور بھائی اسماعیل ایدھی نے کیا ہے۔الجیلانی فاؤنڈیشن نے اس میں دو لاکھ روپے خرچ کئے ہیں۔اسکول کی تعمیراتی کمیٹی میں بھائی پیر محمد دیوان (کنوینر) بھائی عبدالغفار نوتا تکیا، بھائی ہارون چانڈیا اور بھائی عمرا ے رحمٰن شامل تھے۔ان حضرات نے جس خوش اسلوبی اور عمدگی کے ساتھ اس کام کو اختتام تک پہنچایا وہ قابل ستائش ہے اور اس کے لئے میں واقعی تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔

الجیلانی فاؤنڈیشن کا انتظام وانصرام چلانے کے لئے میں نے ایک مجلس منتظمہ تشکیل دی ہے جس میں مینیجنگ ٹرسٹی اور بھائی پیر محمد، حاجی غنی دیوان ٹرسٹی ہیں، دوسرے ارکین میں بھائی اسماعیل ایدھی، بھائی عبدالغفار نوتا تکیا، بھائی ہارون چانڈیا، بھائی عمرا ے رحمٰن، بھائی حاجی عیسیٰ ڈنڈیا اور بھائی اے ستار عثمان عیسیٰ بھائی وکیل شامل

ہیں۔یہ سب لوگ پوری توجہ دے کر کام کر رہے ہیں اور ان کی دلچسپی اور جوش وخروش قابل داد ہے۔

صفورا بائی میمن گرلز بورڈنگ ہاؤس کے انتظامات بھی پہلے بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی کے پاس تھے جواب الجیلانی فاؤنڈیشن نے سنبھال لئے ہیں۔اس کی کمیٹی کا کنوینر میں خود ہوں۔

☛ ☛ ☛

عکسِ بانٹوا

بانٹوا میمن کمیونٹی کی تعلیمی سرگرمیاں

ہجرت کے بعد کراچی میں کھارادر اور نانک واڑا نامی علاقوں میں "رونق اسلام" کے نام سے لڑکیوں کے اسکول قائم کئے گئے۔ یہ اسکول بطور "مادر ملت" مشہور ہونے والی میمن بزرگ خاتون خدیجہ حاجیانی نے شروع کئے۔ بعد میں فیڈرل بی ایریا میں ایک گرلز اسکول اور کھارادر میں گرلز کالج بھی شروع کیا۔ خدیجہ حاجیانی کی ان خدمات کا فائدہ صرف بانٹوا والوں ہی کو نہیں بلکہ پوری میمن قوم اور دوسری اقوام کی بچیوں کو بھی ہوا اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ بہ مشکل تین چار جماعت تک جانے والی عام گھرانوں کی میمن لڑکیاں خدیجہ حاجیانی کے اس عظیم الشان کارنامہ خدمت کی بدولت تعلیم کی بلند ترین چوٹیوں کو فتح کرنے لگیں اور آج وہ بطور لیڈی ڈاکٹر قوم کی خدمت کر رہی ہیں جبکہ وہ انشورنس اور بینکنگ کے شعبوں میں بھی عزت و آبرو سے اپنا رزق حاصل کرنے لگی ہیں۔

میمن ایجوکیشنل بورڈ

کراچی میں میمنوں کی تعلیم کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس بات کا بھی ذکر کرلوں کہ ہجرت کر کے بانٹوا کے علاوہ کاٹھیاواڑ کے مختلف شہروں اور گاؤں سے آنے والے میمنوں کی اکثریت نے کراچی میں ہی سکونت اختیار کی تھی اور یہاں انہیں آغاز میں جن متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑا، ان میں سرفہرست تعلیم کا مسئلہ تھا جسے حل کرنے کے لئے مرحوم جناب سلیمان بھورا کی کوششوں سے میمن ایجوکیشنل بورڈ قائم کیا گیا۔ میمن ایجوکیشنل بورڈ کا مختصراً ذکر گزشتہ صفحات میں کر چکا ہوں، اب ذرا تفصیل سے بتانا چاہتا ہوں۔

کھوڑی گارڈن کے قریب ایک اسکول کی عمارت واقع تھی۔ بانٹوا سے ہجرت کر کے آنے والے خاندان اس عمارت میں عارضی طور پر سکونت اختیار کرتے اور اپنی رہائش گاہ کا انتظام ہو جانے کے بعد وہاں سے چلے جاتے۔ ہم نے اس اسکول کی عمارت کی الاٹمنٹ حاصل کر کے اس میں مدرسۂ اسلامیہ کے نام سے گجراتی میڈیم کا

ایک پرائمری اسکول قائم کرلیا۔ یہ عمارت خالی کرانے کے لئے ہمیں اس میں مقیم خاندانوں کو کچھ رقم دینی پڑی تھی۔ بعد میں کھارادر میں ایک ٹرسٹ کی جگہ الاٹ کرا کے اس میں بھی اسی طرح سے ایک پرائمری اسکول شروع کردیا گیا۔

اس کے بعد تو جیسے ہمیں اسکول کھولنا راس آ گیا۔ اسی کھارادر کے علاقے میں ایک مڈل اسکول کی الاٹمنٹ حاصل کر کے ہم نے اپنی جانب سے مدرسۂ اسلامیہ کے نام سے ایک مڈل اسکول قائم کردیا۔ اس اسکول میں پہلی کلاس کی فیس ایک روپیہ سے لے کر میٹرک تک چھ روپے ماہانہ لی جاتی تھی۔ اس اسکول کے اخراجات کی مد میں ہم 60 فیصد کے قریب حکومت سے حاصل کرتے۔ اسکول کے سب سے پہلے منیجر جناب پان والا تھے۔ کچھ عرصہ بعد مجید بھائی وتھلی والا اس کے منیجر مقرر ہوئے۔

ان دنوں میں صرف تجارت پر ہی توجہ دیتا تھا۔ مجھے دلچسپی بھی تجارتی اداروں میں ہی تھی۔ میں چیمبروں اور ٹمبر مرچنٹ ایسوسی ایشن میں ہراول دستہ یا صف اول میں رہتا۔ میں فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹریز کی مجلس منتظمہ میں چار سال تک رہا۔ ان اداروں کے صدر اور سیکریٹری کی حیثیت سے میرے بیانات اردو، گجراتی اور انگریزی اخبارات کی زینت بنتے رہے جو آج بھی بطور ریکارڈ مع تصاویر میرے پاس محفوظ ہیں۔

جناب سلیمان بھورا مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات بانٹوا انجمن کے وقت سے تھے۔ وہ مجھے اپنا فرزند سمجھتے تھے۔ ہم سب کھوڑی گارڈن میں واقع ابا سیٹھ پان والا کی دکان پر نشست و برخاست رکھتے تھے۔ مرحوم سلیمان بھورا نے 1952ء میں مجھ سے کہا کہ آپ کے آباؤ اجداد نے قوم کی خدمت کرنے میں ہمیشہ عمدہ اور نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے قومی خدمت کا جذبہ اور ولولہ آپ کو ورثہ میں ملا ہے، جماعتوں، قبرستانوں، مسجدوں، انجمنوں ..... الغرض خدمات کے ہر شعبے میں آپ حصہ لیتے رہے ہیں تو پھر آپ میمن ایجوکیشنل بورڈ میں کیوں سرگرم عمل نہیں ہوتے۔

اگرچہ میں نے بہت کہا کہ مجھے ابھی تجارت میں ہی رہنے دیں، اس کام کے لئے ابھی وقت نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے بے حد اصرار کر کے مجھے میمن ایجوکیشنل بورڈ کا رکن بنا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ

جوائنٹ سیکریٹری جیسے بے حد ذمہ دارانہ عہدے پر بھی فائز کر دیا۔

مدرسۂ اسلامیہ کی تعمیرِ نو

مدرسۂ اسلامیہ کے مڈل اسکول کی عمارت اس وقت بے حد بوسیدہ اور بالکل ردی حالت میں تھی۔اس کی تعمیرِ نو کی فوری ضرورت تھی۔اس لئے اللہ عزوجل کا نام لے کر تعمیرِ نو کے لئے فنڈ حاصل کرنے کی تحریک شروع کی گئی۔اس مقصد کے لئے جو بھی روپے دیتا اس کے نام کا کتبہ عمارت میں آویزاں کر دیا جاتا۔چار پرائمری اور مڈل اسکول چلانے کے باوجود طلباء کا اتنا اژدہام تھا کہ عمارت کی تنگی کے باعث ڈبل شفٹ کرنی پڑی تھی۔

پہلے تو ہم درجہ اول کے سوا درجہ دوم میں داخلہ دیتے ہی نہیں تھے کیونکہ زیریں درجے کے طلبا بلند درجے میں پہنچتے تو بعد میں ان درجات میں شاذ و نادر ہی گنجائش رہتی۔اس گنجائش کے پیشِ نظر بلند (Upper) درجات میں محدود داخلے ہی دیے جاتے۔اللہ عزوجل کے فضل و کرم سے معیارِ تعلیم اتنا بلند تھا کہ ہر سال میٹرک کے امتحانات میں ہمارے ایک دو طالب علم میرٹ لسٹ میں کامیاب ہوتے۔

لیکن ہماری سرگرمیاں یہاں تک ہی محدود نہ رہیں۔پاکستان میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کو کے ڈی اے (KDA) کی جانب سے 120 گز کے دو ہزار پلاٹ ملے۔ہمارے مذکورہ اسکولوں کے بلند معیار کی وجہ سے اس کی انتظامیہ اور سیکریٹری و جائنٹ سیکریٹری کی ذاتی نگرانی اور دلچسپی کی تعریف کی جاتی تھی۔دس ایکڑ کا ایک پلاٹ جس کی وسعت 49000 مربع گز تھی۔سوسائٹی نے میمن ایجوکیشن بورڈ کو دے دیا۔اس وقت عوامی فلاح و بہبود کے لئے استعمال میں لئے جانے والے پلاٹ 6 روپے مربع گز کے حساب سے دیے جاتے تھے جن پر مساجد، اسکول اور کالج، دواخانے وغیرہ تعمیر کئے جاتے تھے۔

ہم نے دس ایکڑ (Acre) کے مذکورہ پلاٹ پر 1962ء میں ایک پرائمری اور ایک سیکنڈری اسکول بنایا اور ان اسکولوں کی دونوں شفٹوں میں 800 طلبا تعلیم حاصل کرنے لگے۔اس نئے اسکول کا افتتاح سیٹھ اے واحد آدمجی کے دستِ مبارک سے ہوا۔اس طرح ہمارے کل ملا کر چھ اسکولوں میں تقریباً پانچ ہزار طلبا تعلیم حاصل کرتے

تھے۔

گورنمنٹ کی طرف سے دوسرے اسکولوں کی تعمیر کے لئے تو گرانٹ ملتی تھی۔لیکن ہمیں فیڈرل بی ایریا میں واقع اسکول کی تعمیر کے لئے کسی قسم کی کوئی گرانٹ نہ ملی۔اس کی ساری تعمیر قرضوں (Loans) اور فنڈز کی مرہون منت اور تھی۔البتہ حکومت کی قدر شناسی (Recognization) کے بعد نقصانات کی مد میں 60 سے 65 فیصد ملنے والی رقم ہم عمارات کے کرائے کے حساب میں جمع کر کے رکھتے کیونکہ اس کے آئینی ڈھانچے کی رو سے فیڈرل بی ایریا کے میمن سیکنڈری اسکول کی عمارت میمن ایجوکیشن بورڈ کی ملکیت تھی اور اسکول خود بورڈ کا کرایہ دار تھا۔

میمن ایجوکیشن بورڈ کے اولین صدر جناب حاجی عمر بندھانی تھے۔بعد میں بالترتیب حاجی اے ستار پاکولا والا اور حاجی حسین پاریکھ صدر بنے۔ان کے علاوہ پندرہ اراکین تھے جو سالانہ چندہ دس روپے دیا کرتے تھے۔ جناب سلیمان بھورا شروع سے ہی اس کے اعزازی سیکریٹری تھے اور وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس عہدے پر فائز رہے۔ان کا انتقال 1968ء میں ہوا۔اس وقت سے لے کر 1983ء تک میں اس کا اعزازی سیکریٹری رہا۔

1973ء میں حکومت کی طرف سے تمام اسکولوں کو قومیالیا گیا۔اپنی متعدد کوششوں کے باوجود ہم ایجوکیشنل بورڈ کی تحویل میں چلنے والے اسکولوں کو قومیائے جانے کے جابرانہ اقدام سے محفوظ نہ رکھ سکے۔بعد میں میں نے اسکولوں کے انتظام وانصرام کے متعلق حکومت کو متعدد تجاویز ارسال کیں۔اس وقت کے گورنر سندھ نے مجھے مشیروں کے بورڈ میں نامزد کیا لیکن پھر بھی میری تجاویز پر عمل درآمد نہ ہوا جس کی وجہ سے میں نے استعفیٰ دے دیا۔پھر 1978ء میں اسکولوں کو قومیائیت سے خارج کرنے کے آثار نمودار ہوئے۔میں نے 1980ء میں بھارت میں رائج تعلیمی انتظامات سے فیضان حاصل کرتے ہوئے حکومت کے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا۔بھارت میں رائج تعلیمی انتظام ایسا ہے کہ اسکول تو حکومت کی ملکیت ہوتے ہیں لیکن ان کا انتظام وانصرام نجی ادارے کرتے ہیں۔

پاکستان میں اسکولوں کو قومائیت سے خارج کرانے کے لئے سب سے زیادہ مخالفت اساتذہ (معلمین)

کے حلقوں کی طرف سے کی جارہی تھی کیونکہ وہ نجی مینجمنٹ کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے جبکہ بھارت میں رائج انتظامات میں معلمین کی تنخواہ اور اخراجات حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں۔

میں نے اس طرح کا میمورنڈم تیار کر کے اخبارات میں شائع کرایا تھا جس میں اس قسم کے اسکولوں کے نجی انتظام وانصرام میں اساتذہ کو بھی شامل کئے جانے کا اہتمام کرنے اور تعلیم سے منسلک دوسرے اخراجات منتظم اداروں کو برداشت کرنے کو کہا گیا تھا۔حکومت کو میری یہ تجویز بے حد پسند آئی۔کراچی سے شائع ہونے والے دو گجراتی روزناموں ملت اور ڈان گجراتی نے تو اس منصوبے کے متعلق اداریے بھی شائع کئے تھے۔لیکن بعد میں نہ جانے کیا ہوا کہ بالکل آخری لمحات میں حکومت نے میرا یہ منصوبہ ترک کر دیا۔

میں نے 1981ء میں ایک بیان جاری کیا کہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔اس لئے نئی نسل آگے بڑھے اور میمن ایجوکیشنل بورڈ کے انتظامات سنبھال کر ادارے کو فعال اور سرگرم رکھے۔اس کے جواب میں مجھے جناب پیر محمد کالیا کا فون موصول ہوا۔انہوں نے مجھ سے کہا کہ بورڈ کی ساری تاریخ کے آپ ہی واحد زندہ گواہ ہیں۔سب کچھ ملا کر تقریباً تین کروڑ روپے کی جائیدادیں ہیں جو ایک نہ ایک دن ضرور قومیائیت سے خارج ہو کر آپ کے ادارے کو ملیں گی۔

حقیقت میں میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتا رہا ہوں کہ نئی نسل کو جماعتوں اور بورڈ میں سرگرم اور متحرک حصہ لینے کے لئے آگے آنا چاہیے۔مرحوم سلیمان بھورا کی تن من دھن سے بورڈ کے لئے انجام دی جانے والی خدمات کے باعث ہی آج بورڈ کے اسکولوں کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے کہ قوم کے اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اس بورڈ کے ہی اسکولوں سے میٹرک کر کے آگے آئے تھے۔لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان ہی اسکولوں سے اب تعلیم نوش کر کے آج اعلیٰ عہدوں فائز ہونے یا زور وشور سے تجارت کرنے والے قوم کے افراد بورڈ کے اسکولوں کی ذرا بھی امداد نہیں کرتے۔

ایک اور بات کہنا رہ جاتی ہے۔میمن یوتھ آرگنائزیشن رات کی شفٹ میں اسکول شروع کرنا چاہتی تھی۔ہم

نے اس مقصد کے لئے کھوڑی گارڈن میں مدرسۂ اسلامیہ کی عمارت بلا معاوضہ استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔ یہ نائٹ اسکول بے حد کامیاب رہا اور سینکڑوں طلباء اس شبانہ اسکول کے ذریعے میٹرک کے امتحانات میں پاس ہوئے تھے۔

☛ ☛ ☛

عکس باٹوا

میمنوں کی محلّہ وار جماعتیں

قومی اتحاد اور یگانگت و یکجہتی سے ہی قومیں ترقی کرتی ہیں اور اقوام عالم میں معروف و سرخرو ہوتی ہیں۔ لیکن ہجرت کر کے کراچی آنے کے بعد ہماری قوم کے سربراہوں نے گاؤں کے نام پر مختلف ادارے قائم کر کے قومی اتحاد کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ کاٹھیاواڑ میں تو ہم 25/30 میل پر واقع الگ الگ گاؤں میں آباد تھے اور اس وجہ سے وہاں اس قسم کی جماعتیں وضع ہوتیں تو یہ ایک فطری عمل شمار ہوتا۔ لیکن کراچی میں تو کیماڑی سے لانڈھی تک صرف 25 میل کا فاصلہ ہے اس لئے یہاں پر اس قسم کی گاؤں پرستی کرنے والی جماعتوں کے لئے میرے نقطہ نگاہ سے کوئی جگہ نہیں ہے۔

میری مخلصانہ رائے کے مطابق یہاں گاؤں وار کی بجائے محلّہ وار جماعتیں قائم کرنے کی ضرورت تھی اور ہمیں گاؤں پرستی کے رجحان سے نجات حاصل کرنی چاہیے تھی۔ البتہ اب نئی نسل جوان ہونے سے گاؤں پرستی کا رجحان اور اثر کم ہونے لگا ہے۔

بمبئی میں متعدد گاؤں کے میمن آباد ہوئے لیکن وہاں انہوں نے گاؤں وار جماعتیں قائم نہیں کی تھیں۔ البتہ محلّہ وار جماعتیں قائم کی گئی تھیں۔ ہالائی میمنوں کی طرح کچھی میمن بھی ہجرت کر کے کراچی آئے لیکن انہوں نے یہاں اپنی گاؤں وار جماعتیں قائم

نہیں کی ہیں بلکہ وہ جس محلّہ میں مقیم ہوئے اس محلے کی محلّہ وار جماعت میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح داؤدی بوہرہ بھائی بھی ہجرت کر کے یہاں آئے اور پرانی بوہرہ جماعتوں میں شامل ہو گئے۔ اسماعیلی برادران نے بھی یہاں آنے کے بعد اپنی مقامی جماعتوں میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن ہم یعنی کاٹھیاواڑ کے ہالائی میمنوں نے گاؤں وار جماعتیں قائم کیں۔

ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم اپنے گاؤں کے باشندوں کو تو پہچان سکتے ہیں لیکن دوسرے لوگوں کے ساتھ جان

پہچان کے بغیر رابطہ مناسب نہیں کہا جاسکتا۔ یہ دلیل شروع میں تو معقول لگتی تھی لیکن اب عرصہ دراز کے بعد یہ اپنا وزن کھوتی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی بلڈنگ میں مختلف گاؤں کے میمن مقیم ہونے لگے ہیں۔ اس لئے اب اتحاد کی راہ ہموار ہونے لگی ہے، اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ اس کام کی ابتدا کردینی چاہیے۔ یہ کام ہماری نئی نسل کرسکتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے دکھ ہورہا ہے کہ آل پاکستان میمن فیڈریشن اس کام میں مکمل طور پر ناکام رہی ہے۔

☚ ☚ ☚

عکسِ بانٹوا

قومی اتحاد میں رکاوٹیں

قومی اتحاد میں آڑے آنے والا ایک خصوصی امر سیٹھ صاحبان کا طرزِ عمل ہے۔ یہ سیٹھ جو کروڑں روپے کے فاؤنڈیشنز قائم کرتے ہیں۔ اس میں سے 25 سے 30 فیصد رقم بچا کر انہیں غریبوں کی آبادی کا مسئلہ حل کرنا چاہیے۔ آج ہمارے بھائی گندے غلیظ علاقوں میں جھونپڑیوں جیسے مکانات میں گزر بسر کر رہے ہیں جس کے باعث ان کی جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں کا کریکٹر بھی بگڑ رہا ہے۔ مکان انسان کی پہلی ضرورت ہے۔ بنیادی ضروریات میں آج لباس، تعلیم، اناج اور مکان کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب تک ایک اچھے محلے میں مناسب گھر نہ ہو بچوں کے اخلاق کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی بگڑتی ہے جس کے اثرات پوری قوم پر مرتب ہوتے ہیں۔ بچوں کا کریکٹر ان کی تعلیمی کارکردگی پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔

میرے پاس شعبہ تعلیم کا 30 سالہ تجربہ ہے اور میں نے ملک کے آٹھ نمایاں اور سرفہرست اسکول چلائے ہیں۔ میں مدرسۂ اسلامیہ کا سیکریٹری تھا جس میں پانچ ہزار بچے پڑھتے تھے۔ لیکن وہاں جو بچے گندے غلیظ اور پسماندہ علاقوں سے آتے تھے ان کا اخلاق اور کریکٹر بہت پست قسم کا تھا اور امتحانات میں بھی وہی زیادہ فیل ہوتے تھے۔ کیونکہ تعلیم پر مکان اور ماحول کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اب یونائیٹڈ میمن جماعت آف پاکستان کے نام سے ایک نئی جماعت سامنے آئی ہے۔ اس کے بانی جناب احمد داؤد ہیں اور اس کا مقصد تمام ہالائی میمنوں سمیت سندھی میمنوں کو بھی ایک ہی پلیٹ فارم پر لانا ہے۔ یہ نیا ادارہ اگر محلّہ دار جماعتیں قائم کر کے میمنوں کے آپس میں شادی کرنے کے رواج کی حوصلہ افزائی کر سکے تو یہ ایک عمدہ ابتدا شمار ہوگی اور وہ 10 لاکھ میمنوں کے نمائندے کے طور پر ملک میں نمایاں اور مضبوط کردار ادا کرے گی۔

میمنوں کی تجارت میں نظر آنے والی پسپائی کو روکنے کے لئے انہیں اقتصادی حمایت و حفاظت مہیا کرنا بھی ضروری ہے۔ قوم کی ایک مرکزی کریڈٹ سوسائٹی ہونی چاہیے۔ ڈی فالٹر کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے 5 فیصد سروس چارج رکھنا چاہیے اور نئی نسل کے اراکین کو تجارت میں لانے کے لئے انہیں کریڈٹ کی سہولت بھی فراہم کرنی

چاہیے۔اس خطرے کے پیش نظر کہ رقم ڈوب نہ جائے،ان کی دکان یا تجارت پر نظر رکھنے کے لئے پیڈ اسٹاف کو نامزد کرنا چاہیے اور انہیں لیز کی سہولت بھی مہیا کرنی چاہیے۔

اگر چہ نئی آبادیاں قائم کرنے کے لئے بہت کام ہو رہا ہے۔دھوراجی کالونی میں دھوراجی کے باشندوں کی اچھی خاصی تعداد کو آباد کر دیا گیا ہے جس میں پاکولا والوں کا نمایاں حصہ ہے۔البتہ آبادی کو آباد کرنے کا زیادہ تر کام عام آدمی نے اپنے بل بوتے پر ہی کیا ہے،اس میں کوئی مبالغے والی بات نہیں ہے۔مثال کے طور پر فیڈرل بی ایریا کی آبادیاں آباد کرنے میں سرمایہ داروں کی فاؤنڈیشنوں نے بہت کم کردار ادا کیا ہے۔اسی طرح اسکیم نمبر 33 میں بھی عام آدمی اپنے بل بوتے اور طاقت سے ہی جو کچھ کر سکتا ہے،کر رہا ہے۔

اسکیم نمبر 33 میں متعدد سوسائٹیوں کو زمینیں دستیاب ہوئی ہیں اور اس میں کثیر المنزلہ عمارتیں تعمیر کرنے کے لئے لازم قرار دی گئی اراضیاں بھی حاصل ہوئی ہیں۔فاؤنڈیشن کے عہدہ داران میں مالی سہولتیں مہیا کر کے غریبوں کو آباد کرنے کا مسئلہ بہ آسانی حل کر سکتے ہیں،وہیں پر دکانیں بنا کر وہاں کے مکینوں کو تجارت کی سہولتیں فراہم کی جا سکتی ہیں اور کریڈٹ بینک کے ذریعے انہیں ضروری سرمایہ بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔

بحیثیت میمن ہم ایک ہی قوم کے اراکین ہیں خواہ ہم الگ الگ گاؤں کے باسی رہے لیکن ہم ایک ہی خاندان کے پوتے ہیں۔اس لئے میری مشفقانہ رائے قوم کو بہتر لگے یا ان کے دماغ میں کوئی نیا خیال آئے اور اس کے مطابق وہ اچھی فاؤنڈیشنوں کے عہدہ داروں کی ایک مجلس تشکیل دے کر آبادیاں آباد کرنے کی رفتار کو تیز سے تیز کریں گے تو غریبوں کی دعا سے وہ اور زیادہ امیر ہو جائیں گے۔میرا ایمان ہے کہ قرآن حکیم کی سورۃ بقرہ میں دیئے گئے احکامات و ہدایات کے مطابق عمل کرتے ہوئے آپ نیک ارادے سے کام کریں گے تو بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور کامیابی و کامرانی سے نوازے گا۔غریبوں میں آپ کے لئے جو غصہ،نفرت اور بے اطمینانی کے جذبات ہیں وہ محبت اور احترام میں تبدیل ہو جائیں گے اور زیادہ پختہ پائیدار اتحاد وجود میں آجائے گا۔

دیکھئے مال و دولت تو آنے جانے والی چیزیں ہیں۔جب ہم بھارت سے ہجرت کر کے آئے تو اپنی تجارت وہیں چھوڑ آئے،مشرقی پاکستان سے آئے تو وہاں پر بھی اپنی جائیداد و املاک اور صنعتیں چھوڑ کر آئے۔اب ہم یہاں اپنے ملک میں آزاد ہیں اور آزاد ممالک میں انقلابات آیا ہی کرتے ہیں۔نیشنلائزیشن یعنی قومیانے کا عمل

بھی ہوتا رہتا ہے اور دوسری تبدیلیاں بھی آتی رہتی ہیں۔ کب اور کس قسم کی حکومت آئے گی؟ اس کے بارے میں بھی کوئی پتا نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایسے نیک کاموں میں مال اور محنت لگانے سے غریبوں کی دعائیں ملتی ہیں اور دعا سے آنے والے آفتیں مصیبتیں بھی ٹلتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ نیک کام کرنے سے دل کو اطمینان اور سکون ملتا ہے۔ امیر الامرا یعنی دولت مند کے پاس کسی وجہ سے خواہ دولت چلی جائے لیکن اس کے نیک اور اچھے کام کہیں بھی اور کبھی بھی نہیں جاتے۔ وہ امر ہو کے رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے صاحب مال افراد اور سیٹھ صاحبان اگر میری اس مخلصانہ رائے پر توجہ دیں تو قوم کی کایا پلٹ سکتی ہے۔

بقول علامہ اقبال:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

☚ ☚ ☚

عکسِ باڈتوا

چند گزارشات

1۔ سادگی اور بچت کا فائدہ

انسانی معاشرت میں شادی خوشی کے مواقع آتے ہی رہتے ہیں۔لیکن ان مواقع پر سادگی اپنانے کی بھی ضرورت ہے۔ہمارے اکثر دولت مند لوگ شادی پر اتنا زیادہ خرچ کرتے ہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی نہیں۔اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معمولی مالی پوزیشن کے افراد بھی اپنی عزت نفس برقرار رکھنے کے لئے اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے دل دیا ہے اور وہ سماج کی لعن طعن سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔اس لئے امیر الامرا دولت مندوں کو سادگی اپنانے کی ضرورت زیادہ ہے۔

ان کی اس روش سے عام آدمی متاثر ہوگا اور یہ سوچے گا کہ فلاں فلاں سیٹھ اتنے دولت مند اور امیر کبیر ہونے کے باوجود سادگی سے شادی بیاہ کرتے ہیں تو مجھے بھی اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنا چاہیے۔اس طرح امراء اور دولت مندوں کی ایک حقیر سی تعداد بھی ساری قوم کو کروڑوں روپے کے نقصانات سے محفوظ رکھ سکتی ہے اور قوم میں اپنی عزت واحترام میں اضافہ بھی کر سکتی ہے۔

یہ میری اپنی ذاتی رائے ہے۔قواعد وضوابط تشکیل دینے سے یا قانون بنا کر جرمانہ کرنے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔خود حکومت کچھ نہیں کر سکتی تو جماعتیں کیا کر لیں گی۔البتہ مستحکم ذہنیت وکیفیت سے مالا مال لوگوں کی کمیٹی بنا کر ایسے گراں اور غیر محتاط و نامعقول قسم کے رسم ورواج کے خلاف پیکیٹنگ اور بائیکاٹ کی مؤثر جدوجہد وسرگرمیاں چلانے سے فرق پڑنے کا امکان ضرور ہے۔اس مقصد کے لئے خواتین کی بھی ایک کمیٹی تشکیل دے کر ان سے بھی پیکیٹنگ کرانی چاہیے۔

لیکن یہ بے حد ضروری ہے کہ یہ عورتیں مستحکم ذہنیت و کیفیت سے مالا مال ہوں۔ ایسا کرنے سے ہی یہ بدعت و برائی آہستہ آہستہ ختم ہوگی۔ یہ پرانا مرض ہے اس لئے یہ ایک تشنج سے ختم تو نہ ہوگا۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ پکیٹنگ کرنے والے مردوں اور عورتوں کو اقتصادی فائدہ اور ان پر آنے والی آفتوں کے خلاف انہیں کافی تحفظ بھی مہیا کرنا چاہیے اور اس کام کے لئے ایک ایسا فنڈ بھی قائم کرنا چاہیے جس سے اس تحریک کی رفتار برقرار رہ سکے۔

2۔ بیٹیوں کا مسئلہ

لڑکیوں کا مسئلہ بھی ہماری قوم کا ایک نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ویسے بھی ہمارے یہاں لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی تعداد کم ہے۔ اس لئے لڑکیوں کے لئے رشتوں کی کمی کے سبب مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے میمن فیڈریشن کو چاہیے کہ وہ تمام گاؤں وار جماعتوں کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل کمیٹی ترتیب دے۔ یہ کمیٹی ایک گاؤں کے لڑکوں کی شادیاں دوسرے گاؤں کی لڑکیوں سے کرانے کے نظام کی رفتار کو تیز کرے اور ایسی شادیاں کرا دینے کا اہتمام بھی کرے۔ اس سے گاؤں پرستی کی بری روایت اور بد رسم کو نابود کرنے میں خاطر خواہ مدد مل سکتی ہے۔

3۔ متحدہ اور مرکزی دواخانے

گاؤں وار جماعتوں کی طرف سے الگ الگ دواخانے گاؤں وار جماعت کے نام سے یا والنٹیئر کور کے نام سے چلائے جاتے ہیں۔ خواہ وہ بھی چلتے رہیں لیکن جس طرح اسماعیلی برادران اپنا ایک ہی ہیلتھ سینٹر چلا رہے ہیں اسی معیار کا ایک میمن ہیلتھ سینٹر قائم کر کے اس میں گاؤں وار دواخانوں کی شمولیت کو لازمی بنانا چاہیے۔ ہیلتھ سینٹر کا اپنا مرکزی سیکریٹریٹ بھی ہونا چاہیے اور اس کے عہدہ داروں میں میمن ڈاکٹروں کو بھی شامل کرنا چاہیے جو پورے اسپتال کا وزٹ کر کے اس کا خیال رکھیں اور پوری توجہ سے معاملات کو سمجھ کر ضروری تجاویز جاری کرتے رہیں، اسی طرح بہت بڑی تعداد میں الگ الگ دواخانے چلانے کی بجائے صرف ایک سینٹر عوام میں اور خصوصاً حکومت میں سینٹر کے طور پر معروف ہوگا اور اگر سمجھا جائے تو یہ ایک بہت بڑا فائدہ ہے۔

عکسِ باٹوا

4۔گاؤں وار اسکول

اسی طرح گاؤں کے بینر تلے جو گاؤں وار اسکول چل رہے ہیں ان کے لئے بھی ایک مرکزی ایجوکیشنل بورڈ تشکیل دیا جائے اور درج بالا خطوط پر ہی بورڈ اسکولوں کی نگرانی اور ان کا انتظام بھی کرے۔اس کا بھی ایک مرکزی سیکریٹریٹ ہونا چاہیے اور اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عہدہ داروں کا ایک بورڈ ہونا چاہیے خواہ وہ اسکول اپنے گاؤں کے نام پر ہی کیوں نہ چلتے رہیں۔

اگر ہم اسماعیلی برادران کے نظام کار کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ یہ بے حد گہری اور موثر قسم کی حکمت عملی ہے۔کیونکہ وہ ہر کام کو ایک مرکز کے تحت چلا رہے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک سیاسی طاقت بھی بنے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ عیسائی اور ہندو بھی اسماعیلی برادران کے انداز میں ہی ایسی سرگرمیاں چلاتے ہیں۔مثال کے طور پر ٹاٹا نے سارے بھارت میں خدمتی سرگرمیوں اور بہبودی کاروائیوں کا جال بچھایا ہوا ہے اور اسماعیلی بھائی تو اس قسم کی سرگرمیاں بین الاقوامی سطح پر چلانے میں مصروف ہیں۔

ان کے مقابلے میں میمن قوم شرح آبادی کے لحاظ سے پوری پاکستانی عوام کی ایک فیصد ہونے کے باوجود ملک کی قابل قدر خدمات سرانجام دے رہی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان کی خدمات بالکل ذاتی اور انفرادی طور پر یا گاؤں وار سطح پر ہو رہی ہیں اس لئے وہ چھوٹے چھوٹے حصوں یا حلقوں اور دائروں میں تقسیم ہو جاتی ہیں جس سے وہ فرض کئے گئے اثر سے محروم رہتی ہیں۔مجھے یقین ہے کہ اگر درج بالا حقائق کے مطابق ہماری خدمات و سرگرمیوں میں مرکزیت آجائے تو حکومت اور عوام پر بھی ان کے اچھے اثرات مرتب کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن اس قسم کی مرکزیت کے لئے ایسے قائد کی ضرورت لازمی امر ہے جو اپنی زندگی اس عظیم مشن کے لئے وقف کر سکے۔وہ با اثر اور با وسیلہ بھی ہو اور اقتصادی طور پر بھی مضبوط و مستحکم ہو۔وہ قوم کے لئے وقت اور جان و مال تک قربان کر سکے اور قوم کا اعتماد حاصل کر سکے۔مجھے پورا یقین ہے کہ اگر نیک نیتی اور خلوص سے اس سمت میں کوششیں کی جائیں تو اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی عطا فرمائے گا۔یہ میرا اپنا تجربہ ہے اور میرے درج بالا خیالات کے

مطابق قوم بھی اس قسم کے قائد کو قبول کرے گی اور قوم کے وقار میں اضافہ بھی ہوگا۔

5۔قومی اتحاد کی طرف پیش قدمی

سیٹھ محمد علی رنگون والا کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔انہوں نے لندن میں "ورلڈ میمن فاؤنڈیشن" قائم کر کے بین الاقوامی سطح پر قومی اتحاد کی جانب مؤثر اور قوی پیش قدمی کی ہے۔حقیقت میں انہوں نے ساری دنیا کے میمنوں کو اپنے ساتھ شریک کر کے شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کی ایک مخلصانہ اور دلیرانہ کوشش کی ہے۔

مجھ ناچیز کی رائے میں اگر اس فاؤنڈیشن کی کاروائی اور کارکردگی کو بھی تین شعبوں میں تقسیم کردیا جائے تو وہ زیادہ جامع اور موثر طور پر اپنی خدمات انجام دے سکے گی۔خاص طور پر پاکستان میں پھیلے ہوئے موجودہ حالات کو مدنظر رکھ کر درج ذیل کے مطابق تقسیم ہو تو یہ زیادہ مناسب رہے گا۔

1۔ایجوکیشنل فاؤنڈیشن

2۔ہیلتھ فاؤنڈیشن

3۔بحالی فاؤنڈیشن

ان میں سے پہلی دو فاؤنڈیشنز کے متعلق ہم گزشتہ صفحات میں بحث ومباحث کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ تمام قوم کے گاؤں وار یا انفرادی طور پر چلنے والے دواخانوں اسکولوں اور کالجوں کی مرکزیت قائم کر کے ان کا انتظام والنصرام متعلقہ فاؤنڈیشنوں کے ذریعے کرنا چاہیے۔

بحالی وآبادی فاؤنڈیشن کے متعلق میری تجویز یہ ہے کہ اس کے لئے ورلڈ میمن فیڈریشن کو اپنے یہاں چلنے والے مقامی ٹرسٹوں اور فاؤنڈیشنوں کو اعتماد میں لینا چاہئے۔میرے اندازے کے مطابق یہ مقامی فاؤنڈیشنز ہر سال ڈیڑھ سے دو کروڑ روپے تک کی خیرات کرتی ہیں اور پاکستان کے تمام عوام کو فائدہ پہنچاتی ہیں جبکہ کثیر وافر تعداد میں میمن حاجت مندوں کا حصہ بے حد معمولی یعنی تین سے چار فیصد ہی رہتا ہے۔

عکس باٹوا

مقامی فاؤنڈیشنز اگر ورلڈ میمن فاؤنڈیشن کے شعبۂ بحالی کو اپنی عوامی بہبود کے لئے مختص رقم کا 25 سے 30 فیصد بھی دیں تو ورلڈ میمن فاؤنڈیشن کو تقریباً 40 لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔اس رقم میں راس المال کے ذریعے اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے اور اس سے آبادی و بحالی کے حل کی سمت میں بھی کام ہوسکتا ہے۔

مثال کے طور پر غریب و درمیانہ طبقے کا فرد اگر اپنے وسائل کے ذریعے مکان کے لئے درکار رقم کا 20 فیصد فاؤنڈیشن کے پاس جمع کرائے اور فاؤنڈیشن بقایا 80 فیصد رقم راس المال کی مد میں آسان قسطوں سے ادا کرنے کی شرط پر مہیا کرے تو اس غریب آدمی کی رہائش کے مسئلہ کا دائمی حل نکل سکتا ہے۔

آج سے تقریباً 25 برس پہلے ہم نے فیڈرل بی ایریا میں سوسائٹی کی جانب سے بانٹوا جماعت کو ملنے والے 120 گز کے پلاٹس پر اسی طرح ہی آبادیاں قائم کی تھیں۔صرف چار ہزار روپے مالیت کے مکانات آج لاکھوں کے ہو چکے ہیں۔اس طرح ایک غریب اور مکان سے محروم آدمی لکھ پتی ہوگیا ہے۔

بہر حال میں نے کئی فاؤنڈیشنوں کے سیٹھوں سے یہ بات کہی تو وہ الٹا مجھے کہنے لگے کہ آپ تو قوم کو بھکاری بنانا چاہتے ہیں۔میں نے بانٹوا کالونی فیڈرل بی ایریا کی مثال دے کر کہا کہ ہم نے قوم کو فقیر نہیں امیر بلکہ امیر الامرا بنا دیا ہے،اصل مسئلہ تو نیت نیک ہونے کا ہے۔آپ کے فاؤنڈیشنز بڑے بڑے ہوم (Home) بناتے ہیں،اعلیٰ درجے کے اسکول بناتے ہیں اور فیس کے طور پر 250 روپے ماہانہ حاصل کرتے ہیں۔اس لئے اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ فاؤنڈیشنز زور و شور سے تجارت کر رہے ہیں۔قوم کا عام آدمی اندھا نہیں ہے۔وہ سب کچھ دیکھتا ہے،محسوس کرتا ہے اور پھر آپ پر تنقید کرتا ہے تو آپ کو برا لگتا ہے کہ یہ تو قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہا ہے۔

☞ ☞ ☞

گر تو برا نہ مانے

ہمارے ''بابائے تعلیم'' سیٹھ آدمجی حاجی داؤد کا پوری میمن قوم پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ''میمن ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی'' کی داغ بیل ڈالی۔ گاؤں پرستی کے امتیاز سے بالاتر رہنے والا یہ ایک مرکزی ادارہ ہے جو غریب میمن طلبا کو تعلیم کے لئے مالی امداد مہیا کرتا ہے اور جس کی کوششوں کے باعث آج ہماری قوم میں متعدد ڈاکٹرز، انجینئرز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہرین نظر آتے ہیں۔

سیٹھ آدمجی حاجی داؤد کے فرزند جناب اے واحد آدمجی نے بھی یہاں آدمجی کالج کی بنیاد رکھی اور یہ بھی قابل قدر اور لائق تحسین کام ہے۔ انہوں نے اس کالج میں کئی سیٹیں ریزرو بھی رکھیں تا کہ میمن بچوں کو کالج میں داخلہ حاصل کرنے میں دشواری نہ ہو۔ ایک پارسی سیٹھ کے قائم کردہ این۔ ای۔ ڈی انجینئرنگ کالج میں بھی پارسیوں کے لئے ریزرو سیٹیں رکھی گئی ہیں۔ لیکن میری معلومات کے مطابق داؤد انجینئرنگ کالج میں میمن طلبا کے لئے کوئی ریزرو سیٹیں نہیں ہیں۔ اس میں میمن طلبا کو بھی میرٹ (قابلیت) کے معیار پر ہی داخلہ ملتا تھا۔ اس وقت اس کا انتظام داؤد فاؤنڈیشن ہی کرتا تھا لیکن اس سے میمنوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

سیٹھ آدمجی حاجی داؤد سے قبل بھی سیٹھ جمال اور ستار پیرسٹر وغیرہ میمن قوم میں تعلیم کے فروغ کے لئے اسکالرشپ دیتے تھے۔ لیکن پاکستان میمن ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کی گولڈن جوبلی کے سووینئر کی اشاعت میں ایسے کسی فرد کا تذکرہ تک نہیں ملتا اور یہ نہایت حیرت کی بات ہے۔

کراچی میں ہی میمن ایجوکیشن بورڈ کا قیام عمل میں آیا جس نے مدرسۂ اسلامیہ جیسا عظیم الشان اسکول قائم کیا اور اس میں ایک ہی وقت میں پانچ ہزار طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اتنے بڑے تعلیمی ادارے کے لئے جناب سلیمان بھورا اور حاجی ستار سیٹھ پاکولا والا نے بہت جانی و مالی قربانیاں دیں، میں بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کا بھی ذکر تک مذکورہ سووینئر میں نہیں ہے۔

علاوہ ازیں میمن قوم کی بچیوں میں تعلیم کو فروغ دینے والے ''رونق اسلام'' گرلز اسکولز کی بانی محترمہ خدیجہ حاجیانی کے متعلق بھی سووینئر میں دو الفاظ تک نظر نہیں آتے۔ان گرلز اسکولوں میں میمن قوم کی ساڑھے تین ہزار بچیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور آج ان میں سے متعدد لڑکیاں ڈاکٹرز، ٹیچرز وغیرہ کی ڈگریاں حاصل کر کے قوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔لیکن مذکورہ سووینئر (Souvenir) کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ میمن قوم کی تعلیمی نشوونما اور ترقی میں سیٹھ آدمجی کے سوا کسی کا کوئی حصہ یا کردار نہیں ہے۔

میں نے سووینئر کے کنوینر بھائی عمر فاضل فاروق کی بھی اس طرف توجہ مبذول کرائی۔میں نے ان سے کہا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک تعلیمی میدان میں قابل بیان بلکہ قابل قدر اور نا قابل فراموش کردار ادا کرنے اور قابل داد کارگزاری کا مظاہرہ کرنے والوں کو بھلا دیا جائے جو آج بھی اسی میدان میں متحرک ہیں۔میدان تعلیم میں کام کرنے والا اصل ادارہ تو میمن ایجوکیشن بورڈ ہے۔سوسائٹی تو صرف اسکالرشپ ہی فراہم کرتی ہے جبکہ میمن ایجوکیشن بورڈ مدرسۂ اسلامیہ اور رونق اسلام اسکولوں میں پڑھنے والے طلبا و طالبات کی اسکول فیس بھی معاف کرتا ہے۔صرف یہی نہیں، ایجوکیشن بورڈ کا کردار تو رونق اسلام سے بھی زیادہ ہے۔پاکستان میمن ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کی بات اگر سچ ہے تو اس میں رہ جانے والے ایک نقص کی جانب توجہ مبذول کرانا میں ضروری اور اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

جناب ابراہیم باوانی مرحوم نے آج سے پندرہ بیس سال پہلے اخبارات کے ذریعے ویلفیئر سوسائٹی کے متعلق ووٹ مانگے جس کے نتیجے میں اخبارات میں بہت بحث و مذاکرہ ہوا تھا۔بعد میں جناب باوانی نے مذاکرے کا اختتام کرتے ہوئے کہا تھا کہ ویلفیئر سوسائٹی کی مجلس منتظمہ کی کوئی حیثیت نہیں، یہ صرف مشیروں کا بورڈ ہے۔

یہ میرے نہیں بلکہ مرحوم ابراہیم باوانی کے خیالات ہیں جو اخبارات میں شائع شدہ ہیں اور ریکارڈ پر بھی موجود ہیں۔میں کئی برسوں سے سوسائٹی کا لائف ممبر (تاحیات رکن) ہوں۔سوسائٹی کی طرف سے میمن بورڈنگ ہاؤس چلایا جاتا تھا۔اس میں سوسائٹی کی جانب سے مجھے ہی منتخب کر کے بھیجا گیا تھا۔لیکن ایک سال بعد ہی میں نے استعفیٰ دے دیا۔وجہ یہی تھی جو اوپر بیان کی ہے۔مرحوم جونانی کاکا نے مجھے اور جناب سلیمان بھورا مرحوم کو بورڈ میں کوئی بھی عہدہ پسند کرنے پیش کش کی تھی لیکن ہم نے انکار کر دیا تھا۔

پاکستان میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی میں صدر کا انتخاب ہوتا ہے پھر صدر صاحب ہی سارے عہدہ داروں اور بورڈ کو منتخب کرتے ہیں۔جیسا کہ سوسائٹی کے آئین میں تجویز کیا گیا ہے اور یہ انتخاب زیادہ تر انصاف پر ہی مبنی ہوگا۔لیکن فرض کریں کہ صدر صاحب کسی جماعت کے کارکن کے متعلق معلومات نہیں رکھتے کہ اس کارکن کا اس کی جماعت میں کتنا اثر و رسوخ ہے اور وہ اپنے جماعتی برادران سے فنڈ و عطیات بھی لاسکتا ہے یا نہیں؟ جماعت میں اس کی کتنی اور کس قسم کی شہرت ہے؟ وہ خود بھی اپنی جماعت کو فنڈ عطیہ دیتا ہے یا نہیں؟

ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی کو منتخب کیا جائے تو یقیناً یہ انصاف پر مبنی شمار ہوگا۔لیکن کسی کو صرف امیر و مالدار ہونے کی بنیاد پر نامزد کر دینا ایک مختلف امر ہے۔میں ذاتی طور پر امیر و مالدار کے مقابلے میں کام کرنے والے کارکن کو ہمیشہ زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔میرا مقصد کسی کو حقیر سمجھنا نہیں ہے لیکن اپنے 35 سالہ تجربہ کی رو سے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کام کرنے والا کارکن ہو تو فنڈ بھی ملتا ہے اور ادارے کی نیک نامی بھی ہوتی ہے۔

سوسائٹی نے فیڈرل بی ایریا میں 2000 پلاٹس حاصل کر کے معمولی اور عام آدمیوں کو آباد کرنے کی سرگرمی کی جو سوسائٹی کی ایک قابل بیان خدمت ہے اور اس کا سہرا مرحوم جناب کانداوالا کے سر سجتا ہے۔لیکن افسوس کہ سوویئر میں ان کا بھی کوئی ذکر و تذکرہ نہیں ہے۔صرف اس لئے کہ مرحوم کوئی بڑے مالدار یا دولت مند نہ تھے۔ غریب آدمی اپنی ذات اور جان سے قوم کی کتنی ہی خدمت کرے،اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو قوم کے 95 فیصد عام عوام پر ایسے اثرات مرتب ہوئے بغیر نہیں رہتے کہ دولت مند اور امیر لوگ حکومت اور صدر مملکت کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرنے کے لئے ایسے تماشے کرتے رہتے ہیں کہ وہ قوم کے حقیقی لیڈر ہیں۔

اس لئے سیٹھ صاحبان سے میری عاجزانہ و مخلصانہ گزارش ہے کہ وہ وقت کے بہاؤ کو مدنظر رکھیں اور وقت کے تقاضوں کو نظر انداز نہ کریں۔اپنے مفاد کی خاطر بھی وہ قوم کی تن من اور دھن سے حقیقی خدمت کر کے قوم میں اور قوم سے باہر بھی صحیح معنوں میں اپنا نام روشن کریں تا کہ آنے والی نسلیں انہیں ہمیشہ یاد رکھیں۔

میں نے بھارت میں موجود میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ پاکستانی سوسائٹی کے مقابلے میں زیادہ عمدہ امداد فراہم کرتی ہے۔فنڈ بھی زیادہ حاصل کرتی ہے اور زیادہ طلبا کو امداد بھی دیتی ہے۔

1973ء میں میمن قوم کے اسکولوں سمیت تمام نجی اسکولوں کو قومیا لیا گیا۔اس کے بعد ان کے قومیائے جانے کے خلاف میری اور دوسروں کی طرف سے جو بھی ہو سکا کوششیں کی گئیں۔آخر کار نامدار آغا خان کی کوششوں سے اسماعیلی برادران کے اسکول ڈی نیشنلائز ہو گئے۔پاکستان میمن فیڈریشن بھی اپنے اسکولوں کی ڈی نیشنلائزیشن اور ان کے متعلق ضروری کاروائیوں اور مذاکرات کے لئے میمنوں کے مرکزی ادارے کے طور پر آگے آئی۔

حکومت کے ساتھ شرائط وغیرہ طے کرنے اور آخری فیصلے کرنے کے لئے فیڈریشن کی جانب سے ایک سب کمیٹی ترتیب دی گئی جس کے کنوینر جناب پیر محمد کالیا تھے۔راقم الحروف بھی اس سب کمیٹی میں شامل تھا۔اس سلسلے میں پیر محمد کالیا نے جو بھاگ دوڑ کی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔ان کے علاوہ بھائی ابا علی سوجرہ نے بھی اس کام میں بڑے جوش وخروش اور جانفشانی سے اپنا کردار ادا کیا تھا۔یہ دونوں افراد اپنی قوم کے امیر الامرا نہیں بلکہ عام آدمی ہیں۔اگر چہ اس کام میں معمول کے مطابق سیٹھوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔لیکن ڈی نیشنلائزیشن کے متعلق منعقد کئے جانے والے اجلاسوں میں کوئی سیٹھ یا فیڈریشن کے صدر حاضر نہ رہتے تھے اور انہوں نے اس کام میں پوری طرح سے دلچسپی لینے سے گریز کیا تھا۔

بہر حال ڈی نیشنلائزیشن ہو گئی اور ہمیں اسکولوں کا قبضہ مل گیا تو فنڈ کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔حکومت نے ایک سال تک اساتذہ کی تنخواہ دینا قبول کیا تھا۔اس کے بدلے میں ہم نے پرانے طلبا سے فیس نہ لینے کی حامی بھری تھی۔ڈی نیشنلائز ہونے والے اسکولوں میں ایسے اسکول بھی تھے جنہیں شروع میں سیٹھ صاحبان کے قائم کردہ فاؤنڈیشنز چلاتے تھے۔سیٹھ صاحبان اپنے ان اسکولوں کو واپس لینے کے لئے لیت ولعل کرتے اور ٹال مٹول سے کام لیتے رہے کیونکہ انہیں ٹرسٹ سے روپے دینے پڑتے تھے جس پر اب وہ تیار نہ تھے۔

سب سے بڑا مسئلہ میمن ایجوکیشن بورڈ کے چھ اسکولوں کا تھا۔رونق اسلام کے چھ اسکولز کا مسئلہ بھی خاصا پریشان کن تھا۔کیونکہ ان کے پاس کوئی فنڈز نہ تھے اور ان کے لئے فنڈز کی ضرورت تھی۔رونق اسلام کو بانٹوا میمن جماعت نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ایجوکیشن بورڈ کا اگر چہ چار پانچ سال میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے کا امکان تھا۔لیکن اس کے اور رونق اسلام کے لئے سوا کروڑ روپے کی فوری ضرورت تھی یعنی سالانہ 25 لاکھ روپے سالانہ چاہیے تھا۔اتنی بڑی رقم کس طرح اور کہاں سے حاصل کی جائے؟

آخر میں نے اپنی والدہ صاحبہ کے ٹرسٹ سے پہلے چار سال تک 50 ہزار روپے عطیہ کرنے کا اعلان کیا۔ جناب حاجی احمد پاکولا والا اور دوسرے نئے سیٹھوں نے بھی اچھی ابتدا کی اور یوں اچھے خاصے وعدے مل گئے۔ لیکن یہ بتاتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ قوم کے اس بے حد اہم کام میں امداد دینے کے لئے کوئی بھی پرانا سیٹھ یا امیر الامرا آگے نہ بڑھا اور نہ ہی کسی ٹرسٹ یا فاؤنڈیشن والوں کو توفیق ہوئی۔

ایک مرتبہ میری ملاقات سیکریٹری کے منصب کے ایک سرکاری افسر سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران وہ مجھ سے کہنے لگے۔ ''تمہاری قوم کے سیٹھوں کے بڑے بڑے فاؤنڈیشنز بھی ہیں اور ٹرسٹ بھی، پھر تمہیں کیوں فکر وتشویش ہے؟ تمہیں تو اسکولوں میں فیس لینی ہی نہیں چاہیے۔''

میں نے ان سے پوچھا کہ بھیا! آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟ تو وہ کہنے لگے کہ آپ کے فاؤنڈیشنز اور ٹرسٹوں کے سیٹھ صاحبان ہی کہتے تھے کہ اب اسکولوں کے اخراجات کا بوجھ بھی حکومت نے ہمارے ٹرسٹوں اور فاؤنڈیشنوں پر ڈال دیا ہے، اب اس میں بھی ہمیں قربانی دینے پڑے گی۔

میں نے جواب میں افسر کو سنا دیا کہ ''صاحب! گزشتہ 35 برس سے میں میمن ایجوکیشن بورڈ کا سیکریٹری اور جائنٹ سیکریٹری بھی رہا ہوں لیکن آج تک کسی فاؤنڈیشن یا ٹرسٹ والے نے ہمیں پھوٹی کوڑی بھی عنایت نہیں کی۔ ہمیں تو ایسے عام آدمیوں سے فنڈ ملتا ہے جو تازہ تازہ مالدار ہوئے ہیں۔''

یہ سن کر وہ افسر حیرت سے ساکت وصامت ہی رہ گیا۔ اسے یہ حالت جان کر بے حد حیرت بھی ہوئی اور نہایت افسوس بھی ہوا۔

قارئین! یہ کسی سے سنا ہوا قصہ کہانی نہیں روبرو ہونے والی بات ہے۔

دراصل ہماری میمن فیڈریشن ایک مرکزی ادارہ ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس کے آئین کے مطابق تمام جماعتوں کے نمائندے اس میں شرکت کرتے ہیں اور اسے جمہوری طور طریقے سے چلاتے ہیں۔ فیڈریشن کا موجودہ صدر جناب ذکریا کامدار ایک نیک دل انسان اور معمولی وعام آدمی ہے، سیٹھ نہیں ہے۔ اس نے فیڈریشن کے لئے ایک سپریم باڈی بنائی مگر اس میں صرف امیر آدمیوں کو نامزد کیا، یہ دیکھے بغیر کہ ان لوگوں کا ان کی جماعتوں میں کتنا اثر ورسوخ ہے اور وہ اپنی جماعت کے لئے کیا کچھ کر چکے ہیں اور کتنا فنڈ دیتے ہیں۔ صرف امیر

الامرا کو ہی سپریم باڈی میں لیا گیا ہے۔

لیکن میرا قطعی طور پر یہ استدلال ہے کہ یہ سپریم باڈی ایک پتہ تک نہیں توڑ سکتی۔کوئی بھی جماعت جب تک کام کرنے والے کارکن یا ورکر کی قدر افزائی نہ کرے اور صرف مالدار و دولت کو ہی پیمانہ و میزان بنائے میرے خیال کے مطابق وہ جماعت یا ادارہ کبھی بھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

میں اس موقع پر جناب حاجی علی محمد سیٹھ پاکولا والا کو یاد کئے بغیر نہیں رہ سکتا، خواہ وہ دھوراجی والوں کی ہی امداد کر رہے ہیں یہ میں جانتا ہوں۔لیکن وہ جان بھی قربان کرتے ہیں۔ان کے دوسرے ساتھی بھی دوسرے گاؤں والوں کی اور دوسروں کی امداد کرتے رہتے ہیں۔اسی طرح سیٹھ محمد علی رنگون والا بھی ذاتی طور پر عمدہ عطیہ دیتے رہتے ہیں۔میں کہتا ہوں اگر اپنی قوم میں ایسے دس پندرہ افراد بھی ہوں تو بحالی و آبادی کا مسئلہ حل ہو جائے اور قوم کا کوئی بھی فرد بے گھر یا بے مکان نہ رہے خواہ وہ اپنے گاؤں والوں کے لئے ہی ایثار کرتے رہیں۔

جن دنوں میں بانٹوا جماعت کا سیکریٹری تھا تو دوسروں کے علاوہ سیٹھ احمد داؤد کے رابطے میں بھی رہتا تھا اور ان کے ساتھ گاہے بگاہے قومی امور پر گفتگو کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔میں ہمیشہ ان سے اصرار کرتا رہتا تھا کہ ''سیٹھ صاحب! آپ اراضی کے لئے اور قوم کے بسانے کے لئے کوشش کریں اور اس کے لئے فاؤنڈیشن سے لون (Loan) دیں، بانٹوا کے باشندے آپ کے خاندان سے ہی ہیں۔پڑوسی اور خاندان والوں کی مدد کرنے کا حکم تو اللہ عزوجل نے بھی دیا ہے۔آپ نے فاؤنڈیشن بنایا ہے، اس میں سے ہی دینا ہے، اس لئے کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔'' اس قسم کا میں ان سے اصرار کرتا رہتا تھا۔

اس زمانے میں ایک سندھی غلام علی میمن وزیر بنے۔آغا خان اسکول کے متعلق کتیانہ کے باشندوں کا جھگڑا چل رہا تھا۔سیٹھ احمد داؤد نے مجھ سے کہا کہ آپ کچھ افراد کو لے کر کینٹ میں جناب غلام علی میمن سے ملاقات کریں۔چنانچہ میں اور دس بارہ قومی کارکن وہاں گئے۔وہاں سیٹھ احمد بھی حاضر تھے۔وزیر صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ احمد سیٹھ کی افترا پردازی کیوں کرتے ہیں اور یہ دباؤ ان پر کیوں ڈالتے رہتے ہیں کہ فاؤنڈیشن کے روپے میمنوں کو ہی ملنے چاہئیں؟

اس وفد کا سربراہ اور قائد میں ہی تھا۔اس لئے میں نے جواب دیا کہ:

''صاحب ایسا لگتا ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ہم تو صرف اتنا ہی کہتے ہیں کہ خواہ 80فیصد آپ باہر دیں لیکن بیس پچیس فیصد میمنوں کو بھی دیا کریں۔اور جناب میمنوں میں تو سندھی میمن بھی شامل ہیں۔''

وزیر صاحب میری بات سے متفق ہوئے اور سیٹھ احمد داؤد کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہنے لگے کہ بے شک کہیں نہ کہیں کچھ غلط فہمی ضرور ہوئی ہے۔کیونکہ آپ کی بات معقول ہے۔

سیٹھ احمد داؤد نے جواب میں وعدہ کیا کہ وہ یہ معاملہ فاؤنڈیشن کی میٹنگ میں پیش کریں گے۔لیکن افسوس کہ آج تک اس پر کوئی ذرا سا بھی عمل نہیں ہوا۔

جب داؤد فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا تو بانٹوا جماعت نے بیچ لگژری ہوٹل میں جناب احمد داؤد کو سپاس نامہ پیش کیا اور ان کی بے حد عزت و توقیر کی گئی۔لیکن آج تک فاؤنڈیشن کی طرف سے بانٹوا کے کسی بھی ادارے کو برائے نام چند روپے بھی نہیں ملے۔نہ ہی ہمیں کوئی رقم موصول ہوئی ہے اور نہ بانٹوا جماعت کو ملی ہے۔اس کے برعکس یہ فاؤنڈیشن ہم بانٹوا کے باشندوں کے آڑے آتا ہے یعنی ہم جہاں کہیں بھی فنڈ لینے کے لئے جاتے ہیں تو وہاں ہم سے ایک ہی سوال کیا جاتا ہے کہ داؤد فاؤنڈیشن نے کتنے عطا کئے۔یہ فاؤنڈیشن تو آپ کے گاؤں ہی کا ہے نا؟

یقین کریں اب تو بانٹوا سے تعلق رکھنے والے مخیّر حضرات بھی یہ سوال کرتے ہیں۔کس کس کو اور کیا کیا جواب دیا جائے۔

☞ ☞ ☞

ملّت کے نوجوانوں کی نذر

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار عقیق کٹا پھر نگیں ہوا

بانٹوا اور کراچی میں میمن قوم کے تمدن و ترقی اور عروج و زوال سے متعلق اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب کے اس آخری باب میں مخلصانہ طور پر میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لئے کسی قسم کے تعصب، حسد و کینہ اور خود غرضی کے بغیر اپنی قوم کی خدمت کریں اور کسی بھی کام کا آغاز کرنے سے پہلے اس کے متعلق اچھی طرح غور و فکر کرنے کے بعد اچھے اور برے نتائج کا اندازہ کر لیا کریں۔ لیکن ایک مرتبہ فیصلہ ہو جائے کہ یہ کام کرنا ہے تو خواہ آپ پر کیسی ہی تنقید کیوں نہ کی جائے اور کیسا ہی کیچڑ کیوں نہ اچھالا جائے آپ نے پسپا نہیں ہونا، قدم پیچھے نہیں ہٹانا۔

بھارت کے بابائے قوم گاندھی جی نے شراب کی ممانعت کے لئے تحریک شروع کی تھی جس میں عورتوں اور جوانوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ ان دنوں میں کسی کام سے راجکوٹ گیا تو میں نے مشاہدہ کیا۔ جوان عورتیں پیکٹینگ کر رہی تھیں وہ شراب کی دکان کے سامنے ستیاگرہ کرتی تھیں۔ دکان پر کوئی شراب خریدنے آتا تو اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اسے سمجھاتیں۔ وہ نہ مانتا تو لمبی ہو کر فٹ پاتھ پر لیٹ جاتیں اور کہتیں کہ ہمیں کچل کر دکان میں جانا چاہیں تو جائیں، ایسے تو نہیں جانے دیں گی۔

لیکن ہم لوگ ضابطہ شکنی کے خلاف قراردادیں پیش کرتے ہیں، اخباروں میں مراسلات ارسال کرتے

ہیں اور صرف باتوں کے بڑے ہی بناتے ہیں مگر اس کے مطابق قربانی دینے کو جیسے مانتے ہی نہیں۔ جب تک قربانی نہ دی جائے کچھ نہیں ہوسکتا اور قوم کو برے رواج و رسوم سے نجات نہیں دلائی جاسکتی۔ اگر صرف بیس پچیس جوان اور بیس پچیس عورتیں بھی ہوں جن کی قوت نفس مضبوط اور قوت ارادی قوی ہو تو انشاء اللہ بدی و برائی کو جڑ سے اکھاڑ کر نکال پھینکنا کوئی مشکل کام نہیں۔

ہماری ایک سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم کسی سیٹھ کے خلاف تو کوئی اقدام ہی نہیں کرتے۔ حق تو یہ ہے کہ سیٹھ صاحبان ضابطہ شکنی کریں تو ان کے خلاف ضرور قدم اٹھانا چاہیے۔ ایسا کرنے سے عوام الناس پر گہرا اثر مرتب کیا جاسکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ فیڈریشن کے صدر مرحوم اے کریم سومار نے فیڈریشن کی ضابطہ شکنی کی پاداش میں ایک سیٹھ کے خلاف اقدامات کئے تو اس سیٹھ کی جماعت نے ان اقدامات کی مخالفت کی تھی۔ اگر انہوں نے ذرا سی بھی غلطی کی تھی تو اپنی قوم کے مفاد میں اس جماعت کو فیڈریشن کے صدر کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ اقدامات قوم کے وسیع تر مفاد کو مدنظر رکھ کر کئے گئے تھے۔ لیکن سیٹھ کی جماعت تو فیڈریشن کے ساتھ لڑنے پر تیار ہوگئی تھی۔

جہاں وفاداریوں کی ایسی اقسام رائج ہوں وہاں رواج بد کو ختم کرنے کے لئے کون آگے آئے گا اور فیڈریشن بھی کیا کرے گی؟ میں اس موضوع پر اس وقت وکلاء کے نوٹس اور اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات پڑھتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ اگر میں اس معاملے میں خاموش رہا تو اللہ تعالیٰ کا گنہگار ہوجاؤں گا کہ ایک بڑے آدمی کے خلاف میں نے آواز حق بلند نہیں کی۔ چنانچہ میں نے اس جماعت کے سابق سیکریٹری کی حیثیت سے ایک بیان دیا کہ فیڈریشن کے صدر نے شاید غلطی کی ہو پھر بھی یہ اقدامات پوری میمن قوم کے مفاد میں ہیں اور میری دعا ہے کہ میری جماعت کو بھی ایسا ہی صدر ملے۔

میرے اس بیان سے قوم میں نہایت جوش و خروش پیدا ہوا اور مجھے مبارکباد دینے اور حوصلہ و جوش بڑھانے والے ٹیلی فون، ٹیلی گرام اور خطوط کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس کے بعد میں نے جماعت والوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ معاملہ اب رفع دفع نہ کیا گیا تو میں جوانوں کو آگے کرکے ان کی قیادت کروں گا۔ اس لئے برائے مہربانی جماعت اور قوم کے اتحاد و مفاد میں اس معاملے کو یہیں پر ختم کردیا جائے۔

میں نے یہ بیان کافی غور و فکر کرنے کے بعد جاری کیا تھا اور مجھے اس کے نتائج کی کوئی پروا نہیں تھی اس لئے یہ بات ختم کر دی گئی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک قوت ارادی، طاقت نفس اور قوت فیصلہ قوی اور مضبوط نہ ہو اس وقت تک کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

ابھی حال ہی میں بانٹوا راحت کمیٹی اور بانٹوا انجمن نے مشترکہ طور پر ایک پلاٹ خرید کر غریبوں کو بسانے کے لئے مکانات تعمیر کرنے کا سنگ بنیاد رکھا تو ایک بڑی فاؤنڈیشن کے مالک جیسے ایک سیٹھ نے اس کی اطلاع ملنے پر مجھ سے کہا کہ تم تو اس طرح قوم کو فقیر بناتے ہو۔

میں تو کہتا ہوں کہ یہ سیٹھ صاحبان جو 70/75 لاکھ روپے لگا کر اس کے کرائے کھا کھا کر منافع خوری کریں اس کی بجائے فاؤنڈیشن کے عہدہ داروں کا اولین فرض تو یہ ہے کہ وہ ایک میمن آبادی و بحالی فاؤنڈیشن قائم کریں جو قوم کی آبادی و بحالی کا مسئلہ حل کرے، لوگوں کو مکان کا مالک بنائے، انہیں فقیر نہیں امیر بنائے۔ فیڈرل بی ایریا اور دھوراجی کالونی میں سیٹھوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ انہوں نے مکانات تعمیر کرا دیے۔ اس طرح انہیں بھی روپے مل گئے اور غریبوں کے علاوہ درمیانہ طبقہ کے لوگوں کے اپنے ذاتی مکان بھی ہو گئے۔ اس وقت پانچ دس ہزار روپے میں ایک مکان تعمیر ہوتا تھا۔ آج کل یہی مکان دو سے اڑھائی لاکھ روپے میں فروخت ہوتا ہے تو کیا قوم فقیر ہو گئی یا امیر ہوئی؟

زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہ سیٹھ صاحبان ایک تو قوم یا جماعت کو روپے بھی نہیں دیتے اوپر سے ایسی بھڑکانے اور غلط راستے پر لے جانے والی باتیں بھی کرتے ہیں کہ جس سے لوگوں پر خلاف معمول برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ میں یہ باتیں خدانخواستہ کسی کو ذلیل و رسوا کرنے کے مقصد سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی حکم ہے کہ سچ بات کہنے میں کسی سے مرعوب اور خوفزدہ نہ ہوں ورنہ میرے گنہگار ہو جاؤ گے۔ چنانچہ میری اپنی عقل و دانش کے مطابق مجھے جو بات حق لگی ہے وہی قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ کسی کے خیال میں اگر مجھ سے کہیں بھی کوئی غلطی ہوئی ہے تو میری توجہ اس غلطی کی جانب مبذول کرائی جائے اور دلائل سے مجھے قائل کیا جائے تو میں کوئی تردد و تامل کئے بغیر لوگوں سے معافی مانگ لوں گا۔

جب میمن ایجوکیشن بورڈ کے آٹھ اسکول ڈی نیشنلائز ہوئے تو مجھے روپے کے لئے بہت فکر و پریشانی ہوئی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ایسے نیک کاموں میں اللہ تعالیٰ کی مدد مل ہی جاتی ہے۔ پانچ چھ سال

پہلے سیٹھ احمد داؤد کہتے تھے کہ اسکولز واپس حاصل کریں، تیس چالیس فیصد روپے میں امداد کے طور پر دوں گا۔ یہ باتیں وہ مجھے اپنے آفس میں طلب کر کے کہتے تھے۔

پھر جب اسکولز واپس حاصل ہونے کا بندوبست ہوا تو سیٹھ صاحب کہنے لگے کہ نہیں، نہیں ہمیں اسکول واپس نہیں لینے۔ پھر بھی ہم نے اسکولز واپس اپنی تحویل میں لے لئے تو اس کے لئے ہمارے نئے سیٹھ صاحبان نے تو بہت امداد دی۔ لیکن داؤد فاؤنڈیشن اور میمنوں کی دوسری فاؤنڈیشنوں نے کوئی مالی امداد فراہم نہ کی۔

بانٹوا میں "محمڈن لاء" لاگو کرنے کی تحریک بانٹوا انجمن نے شروع کی تو سلیمان بھورا جیسے ایک ملازمت کرنے والے آدمی نے کروڑ پتی سیٹھوں کا سامنا کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیاب و سرخرو کیا۔

میری باتوں پر آپ کے دل و دماغ میں شاید ایسے خیالات پیدا ہو رہے ہوں گے کہ بھائی دوسروں کو واعظ و نصیحت فرما رہے ہیں لیکن خود قوم کے سامنے نہیں آتے۔ تو اس کا جواب میری اس کتاب میں تفصیل سے موجود ہے کہ ان سیٹھوں کے خلاف ابتدا میں کس نے قیادت و سربراہی کی تھی۔ اب میری عمر 68 سال ہوگئی ہے۔ میرے دل و دماغ میں اب پہلے جیسی قوت و طاقت بھی نہیں رہی۔ پھر کیا یہ ضروری ہے کہ کتابوں کے مصنف قیادت و سربراہی بھی خود کریں؟

اس کے باوجود میں آج بھی پورے خلوص سے کہتا ہوں کہ اگر قوم کے نوجوان آگے آئیں تو میں اپنی جانب سے انہیں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

☜ ☜ ☜

ختم شد

آج کا بانٹوا

عبدالرزاق تھاپلہ والا

عبدالرزاق تھاپلہ والا بانٹوا کاٹھیاواڑ میں پیدا ہوئے۔آپ نے کراچی یونیورسٹی سے کامرس اور قانون میں گریجویشن کیا، آپ انسٹی ٹیوٹ آف کاسٹ اینڈ منیجمنٹ اکاؤنٹس آف پاکستان کے فعال رکن ہیں۔ یونائیٹڈ میمن جماعت کے سیکریٹری کے فرائض ادا کئے اور میمن پروفیشنل فورم کے 1981ء اور 1990ء میں صدر رہے۔ ملک بھر کے اخبارات اور پیشہ ورانہ رسائل و جرائد میں آپ کے 100 سے زائد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔15 نومبر 1947ء کی رات کے وحشتناک واقعات کے بعد بانٹوا سے ہجرت کرنے والوں میں بھائی عبدالرزاق تھاپلہ والا کا خاندان بھی شامل ہے۔ جو نومبر کے تیسرے ہفتے میں پاکستان چلا آیا تھا۔اس وقت رزاق بھائی کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ ہجرت کے 58 سال بعد انہیں پہلی بار 2005ء میں بانٹوا جانے کا اتفاق ہوا۔اس وقت زیرِ نظر کتاب کیلئے بھائی عبدالرزاق تھاپلہ والا نے تازہ ترین مضمون بانٹوا سے متعلق تیار کیا ہے۔ جسے ہم کتاب ''عکسِ بانٹوا'' میں ''آج کا بانٹوا'' کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔

''میں کراچی سے پی آئی اے کی فلائٹ کے ذریعے 21 مارچ 2005ء کو صبح نو بجے روانہ ہوا اور ہندوستانی وقت کے مطابق گیارہ بجے بمبئی ایئر پورٹ پر اترا۔ میں نے ممبئی میں اپنے ایک دوست کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔اس نے میری درخواست پر میرے لئے اسی شام 7 بجے کی فلائیٹ سے راجکوٹ کے لئے سیٹ بک کروا رکھی تھی۔ ممبئی سے راجکوٹ کی پرواز 45 منٹ کی تھی۔ایئر پورٹ پر میرا دوست فاروق مجھے لینے آیا تھا۔

دوسری صبح یعنی 22 مارچ کو میں جوناگڑھ کے لئے روانہ ہوا۔ چونکہ سڑک بہت اچھی تھی اس لئے مجھے جوناگڑھ پہنچنے میں صرف دو گھنٹے لگے۔راستے میں ہم جیت پور شہر سے گزرے۔

سب سے پہلے میں داتا دربار گیا مگر چونکہ داتا صاحب کا مزار ایک پہاڑی پر واقع ہے اور میرے لئے اتنی چڑھائی چڑھنا ممکن نہ تھا اس لئے میں نے داتا صاحب کے چلے والی درگاہ کی زیارت ہی پر اکتفا کیا۔یہ چلہ داتا دربار کو

جانے والی سیڑھیوں کے پاس ہی واقع ہے اور بڑا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔

رات میں نے جوناگڑھ کے ایک ہوٹل میں بسر کی اور 23 مارچ کی صبح بانٹوا کے لئے روانہ ہوگیا۔بانٹوا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔بانٹوا جہاں سے میں صرف گیارہ برس کی عمر میں ہجرت کرگیا تھا۔میرا پیارا بانٹوا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔جہاں کی یادیں اٹھاون برس گزرنے کے باوجود بھی میرے ذہن میں تازہ تھیں۔میں اتنے طویل عرصے بعد ایک بار پھر اسی شہر میں جارہا تھا۔میری کیفیت عجیب تھی۔دل میں غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات موجزن تھے اور ذہن میں بچپن کی سینکڑوں تصویریں فلم کی طرح گزر رہی تھیں۔اسی جذباتی کیفیت میں راستہ طے ہوتا رہا۔سڑک اچھی تھی۔راستے میں وتھلی اور ماناوَدر آئے۔وتھلی کی آبادی آجکل بیس ہزار کے لگ بھگ ہے جس میں تقریباً چار ہزار مسلمان ہیں۔ان میں سے پندرہ سو کے قریب میمن برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

وتھلی کے بعد ہم ماناوَدر سے گزرے۔دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً 22 کلومیٹر ہے اور ماناوَدر سے بانٹوا صرف 8 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔یہ فاصلہ بھی کوئی فاصلہ تھا۔منٹوں میں اپنی جائے پیدائش پر پہنچ گیا۔میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر وہی شہر تھا جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی۔میں نے سب سے پہلے بانٹوا میونسپلٹی کے دفتر کا رخ کیا جو آجکل بانٹوا میونسپل بیورو کہلاتا ہے۔یہ دفتر اس عمارت کی پہلی منزل پر واقع ہے۔جہاں ہمارے زمانے میں محمڈن لائبریری ہوا کرتی تھی۔میں میونسپلٹی کے افسروں سے ملا اور انہیں بتایا کہ میں اپنی جائے پیدائش دیکھنے آیا ہوں۔وہ بڑی مہربانی سے پیش آئے اور انہوں نے اپنا ایک آدمی میرے ساتھ کردیا کہ مجھے شہر دیکھنے میں آسانی ہو۔

میں نے اس کے ساتھ بانٹوا دیکھنے کا آغاز اس جگہ سے کیا جہاں شہر کا صدر دروازہ (زاپا) ہوا کرتا تھا۔مگر اب وہاں دروازے کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔بہرحال ہم صدر دروازے کے اندر بازار سے ہوتے ہوئے جامع مسجد تک گئے۔یہ مسجد بڑی خوبصورت ہوا کرتی تھی اور اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اسکی اندرونی اور بیرونی حالت بہت اچھی ہے۔میرا گھر جامع مسجد کے عقب میں جانگڑا فلیا میں تھا۔اس طرف جانے والے راستے کے شروع میں آدم حاجی پیر محمد کا مکان، دفاتر اور موٹر گیراج ہوا کرتے تھے۔افسوس کہ اس علاقے کی تمام عمارتیں وقت کے ہاتھوں یا تو تباہ ہوچکی ہیں یا گرائی جاچکی ہیں۔ان میں آدم حاجی پیر محمد کے رہائشی مکان اور گیراج بھی شامل ہیں۔مجھے صرف ایک احاطہ نظر آیا۔جس پر تالہ پڑا ہوا تھا۔

پھر ہم اس مکان کی طرف بڑھے جہاں میں رہا کرتا تھا مگر صد حیف کہ وہ مکان باقی نہیں تھا۔وہی کیا جانگڑا

عکسِ بانٹوا

فلیا آگاسی فلیا اور نکوٹ کے راستے کے سارے ہی مکان گرائے جا چکے ہیں اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ کہاں کیا تھا۔ دل میں حسرت و یاس لئے میں صدر دروازے کے اندرونی علاقے سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے باہر بازار ہے۔ جس میں مختلف قسم کی دکانیں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ہر دکان میں اچھی خاصی دکانداری ہو رہی تھی۔ یہاں میری ملاقات بھائی صدیق پولانی کے ایک دیرینہ دوست نکوم ایڈوکیٹ سے ہوئی۔ میں نے انہیں تاریخ بانٹوا کی ایک کاپی دی جو مجھے صدیق بھائی نے دی تھی۔ نکوم ایڈوکیٹ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور شہر کے دورے پر میرے ساتھ ہو لئے۔

صدر دروازے کے باہر ایک مسجد ہوا کرتی تھی جسے ہم باہر والی مسجد کہتے تھے۔ اب وہ بند پڑی تھی اور اسکی حالت بہت خستہ تھی۔ میں بخاری صاحب کے مزار پر بھی گیا۔ مزار اب بھی بڑی اچھی حالت میں ہے اور اس کے اردگرد خوبصورت باغ لگایا گیا ہے۔ واپسی میں ہم اس مسجد کے قریب سے گزرے جو حسین قاسم دادا نے تعمیر کروائی تھی۔ اس کی حالت بہت ہی خراب تھی۔

پھر ہم مدرسۂ اسلامیہ اور یتیم خانے کی طرف چل پڑے۔ یتیم خانے میں اب لڑکیوں کا ایک اسکول قائم ہے جبکہ مدرسۂ اسلامیہ میں لڑکوں کا اسکول چل رہا ہے۔ دونوں اسکولوں کا انتظام ایک ٹرسٹ چلا رہا ہے۔ کچھ عمارتوں کی مرمت ہو رہی ہے اور کچھ نئے بلاک بھی زیر تعمیر ہیں۔ دونوں اسکولوں کو سن شائن اسکول کا نام دیا گیا ہے۔ مدرسے کی افتتاحی تختی پر آج بھی یہ عبارت موجود ہے:

"مدرسۂ اسلامیہ کا افتتاح لیفٹیننٹ کرنل جے۔ اے۔ آئل فیلڈ، پولیٹکل ایجنٹ، سورتھ پرانت (صوبہ)، نے 21 دسمبر 1930ء کو فرمایا"

اور یتیم خانے کی افتتاحی تختی پر لکھا ہے:

"اس عمارت کا افتتاح بانٹوا سردار گڑھ دربار صاحب زبردست خانجی کے دست مبارک سے بروز منگل بتاریخ 21 جمادی الآخر 1356 ہجری بمطابق 8 اگست 1939ء کو ہوا"

مدرسۂ اسلامیہ جاتے ہوئے میری نظر بانٹوا جیم خانہ اور مسلم ٹرسٹ پراپرٹی کی عمارتوں پر پڑی۔ مجھے بتایا گیا کہ بانٹوا کی کچھ مساجد اور درگاہوں کی دیکھ بھال دھوراجی کے میمن کر رہے ہیں اور بانٹوا کے میمن اس کام میں شریک نہیں ہیں۔ مدرسے اور یتیم خانے کے بعد میں پرانے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن کی بیرونی عمارت مجھے ویسی ہی لگی جیسی میرے بچپن میں تھی مگر اندرونی حصہ خاصہ بدل چکا ہے۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر اب بھی مسافروں کے لئے گجراتی میں لکھی ہوئی ہدایات موجود ہیں مگر عمارت کی دوسری جانب ریلوے اسٹیشن یا ریلوے کی پٹری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے کیوں کہ اب بانٹوا میں ریل نہیں چلتی۔

اسٹیشن سے میں وہ ہسپتال دیکھنے گیا جو حاجی حبیب کلکتہ والا نے بنوایا تھا۔ہسپتال کی عمارت گو کہ پرانی ہی ہے مگر اتنی بری حالت میں نہیں ہے۔اس عمارت میں اب ایک لائبریری قائم ہے۔ہسپتال کے پہلو میں حاجی حبیب نے ایک مسجد بنوائی تھی۔جواب ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔ممبر اور تمام محرابیں یا تو ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں یا گر چکی ہیں۔ اس میں اب ایک مسلمان خاندان رہتا ہے۔انہوں نے ہم سے کہا کہ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے جوتا اتار دیں۔ ہم نے جوتے اتارے اور اندر داخل ہو گئے۔مگر اندر جا کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔مسجد کی حالت ابتر تھی۔نہ منبر نہ کوئی محراب لے دے کر فرش پر نماز کی صف بندی کیلئے ڈالی گئی لکیریں موجود تھیں۔ہم مسجد سے باہر آئے۔ہسپتال کے سامنے بانٹوا کا اکلوتا سینما گھر ''کوہِ نور ٹاکیز'' ہوا کرتا تھا۔اب وہ بند پڑا ہے۔معلوم ہوا کہ کچھ برسوں تک تو وہ ''جے ہند سینما'' کے نام سے چلتا رہا پھر بند کر دیا گیا۔

وہاں سے ہم بانٹوا میمن جماعت خانے کی طرف گئے۔جماعت خانے کے ایک حصے میں اب ایک سندھی اسکول قائم ہے۔میں نے وہ کلاس روم دیکھا جہاں میں نے مدرسۂ اسلامیہ میں داخلہ لینے سے قبل پہلی جماعت تک پڑھتا تھا۔مجھے تمام کلاس روم ٹھیک ٹھاک حالت میں نظر آئے اور تقریباً سبھی کمروں میں اسکول ڈیسک بھی دکھائی دی۔

اسکے بعد ہم بانٹوا سے باہر نکلے اور پاچوڑ روڈ کی طرف چل دیئے۔میں احمد داؤد کی جننگ فیکٹری دیکھنا چاہتا تھا۔مگر اب اس میں ایک آئل مل چلائی جا رہی ہے۔پھر میرے ساتھی مجھے دانی لال کالی لال کے گھر لے گئے جو حاجی حبیب کلکتہ والا کے منیجر ہوا کرتے تھے۔وہ 10 اپریل 2001ء کو انتقال کر چکے تھے۔ان کے بیٹے کانتی بھائی نے ہمیں گھر میں مدعو کیا اور چائے پلائی۔کانتی لال خود بھی ایک ریٹائرڈ آدمی ہے۔میں نے ان کے پاس کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ دیکھا۔کہا جاتا ہے کہ آجکل بانٹوا کی آبادی اٹھارہ ہزار ہے۔جس میں صرف ڈیڑھ سو مسلمان ہیں۔ میمنوں کے صرف تین چار خاندان ہی وہاں باقی بچے ہوئے ہیں۔انتظامی لحاظ سے بانٹوا، تھاپلہ اور کوڈاؤ جونا گڑھ ڈسٹرکٹ کے ماناوَدر تعلقے میں آتے ہیں۔

ہم بانٹوا سے نکل کر مضافات کی طرف بڑھ گئے اور وہ اسلئے کہ میں تھاپلہ نامی گاؤں دیکھنا چاہتا تھا۔میرا خاندانی لقب ''تھاپلہ والا'' تھا۔مگر میرے بزرگوں نے کبھی مجھے اس لفظ کے معنی نہیں بتائے تھے۔پاکستان آنے کے بعد میں نے صوبہ گجرات کا نقشہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ بانٹوا کے اردگرد کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جہاں کے رہنے والے اپنے اپنے گاؤں کے ناموں کی نسبت سے پہچانے جاتے تھے۔ایسا ہی ایک گاؤں ''تھاپلہ'' بھی تھا۔

مجھے اپنا وہ آبائی گاؤں دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ چنانچہ ہم اس طرف چل پڑے۔ راستے میں ہمارا گزر کوڈواؤ نامی دیہات سے ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ کوڈواؤ کی آبادی تقریباً ڈیڑھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے جن کا تعلق پٹیل برادری سے ہے۔

کوڈواؤ سے ہوتے ہوئے ہم تھاپلہ پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جس کی آبادی چھ سو کے لگ بھگ ہے۔ گاؤں کے باہر پیر گیبن شاہ کا چلہ اور مزار ہے اس کی دیکھ بھال فقیر اللہ رکھا قاسم اور ان کی بیوی کرتے ہیں۔ کوڈواؤ اور تھاپلہ دونوں ہی گاؤں میں چھوٹے چھوٹے اسکول ہیں۔ تھاپلہ کا اسکول تو اسٹڈی سینٹر کہلاتا ہے اور کوڈواؤ کے اسکول کو اسکول کہا جاتا ہے۔ تھاپلہ دیکھنے کے بعد میرا واپسی کا سفر شروع ہوا۔ میں جوناگڑھ جانے کے بجائے سردار گڑھ اور دھوراجی سے ہوتا ہوا براہ راست راجکوٹ کے لئے روانہ ہوا اور شام تقریباً چھ بجے وہاں پہنچ گیا۔ یہ 23 مارچ 2005ء کی بات ہے۔ دوسری صبح میں نے ممبئی جانے والی فلائٹ لی جہاں مجھے ورلڈ میمن آرگنائزیشن (WMO) کی کانفرنس میں شرکت کرنی تھی"۔

☜ ☜ ☜

عکسِ باتوا

Bantva Memons' Surnames

The identities of different Memon families and clans of Bantva Memons are quite old. These are known as Atak / Zaat or Identity and used as Surname or Family name. The Bantva Memons are divided into different castes, clans and families. Like other Memon castes, the use of caste or any other identity at the end of the name is also customary in Bantva Memons. These Ataks/Zaats or Surnames / Family Names (Denoting the native village or trade of forefathers) are considered as a pride and a durable memorial of the family or clan. The Surnames / Family Names totaling 287 names are as follows.

A

AAKA
ADHI
AGAR
AKHAI
ALLANA
AARBI
ADVANI
AGRA WALA
AKHA WALA
AMODI MAMDODI
ADAYA
AFIN WALA
AAJKIA
AKOOLI
AVEDIA

B

BADI
BAGHA
BAKHAI
BAMNASARWALA
BAREL
BEGA
BHALGAMWALA
BHARAMCHARI
BHOOT
BHUTDA
BIJUDA
BILLARIWALA
BOCHA
BADLA
BAGLA
BAKHAR
BANDHANI
BATTI WALA
BERIA
BHALLU
BHARUCHWALA
BHURA
BHUTKIA
BIKIYA
BILLOO
BURI WALA
BAGSARAWALA
BAKALI
BALAGAMWALA
BANGLORIA
BAWADOSA
BHADULAWALA
BHANGDA
BHATDA
BHURI
BIDDU
BILLA
BILWANI

C

CALCUTTA WALA
CHAMDIA
CHADDI
CHICHRA
COCHIN WALA
CHAWALA
CHANNA
CHATNI
CHIKNA
CUDEKI WALA
CHALIA
CHIRKLA
CHAUTA WALA
CHINI
CUTLERY WALA

D

DADA
DADHRIA
DAI
DALAL
DANDIA
DARVIA
DHAMIA
DHARAWAD WALA
DHEEDH
DHISIDIA
DHUKA
DIWAN
DOCTER
DOJKI
DONI
DUNGARGADH WALA
DURVESH

E

ESSANI

F

FANSIYA
FATTANI
FULOORI
FUSRA

G

GADAK WALA
GADHWANA WALA
GALLA
GANDHI
GAROND WALA
GERMAN
GHADIALI
GHAFOOR
GHANCHA
GHANI WALA
GHAZI
GHAZIPURA
GHEE WALA
GHELI
GHERIA
GHOGA
GHUSLA
GIDERWALA
GIRI
GOAWALA
GOGAN
GOGITA
GUDWAIWALA
GUNDARA
GUNG
GURWALA

H

HALARI
HARMAN
HAROON

I

INDARWALA

J

JAKA
JAKRAWALA
JALNAWALA
JAMAL
JANGDA
JAWAWALA
JHAVERY
JHANDIA

K

KABLA
KAJA
KALIYA
KALMESAR WALA
KALUDA
KANDA
KANDHOI
KANPUR WALA
KAPADIA
KAPASIA WALA
KARA
KARI
KARNOL WALA
KASBATI
KATIYA
KATOLWALA
KAVALKA WALA
KAYA
KESODIA
KHADELI
KHADIAWALA
KHAMBLAWALA
KHAMIDANA WALA
KHAMISA
KHANA
KHANANI
KHATKI
KHIDRIA
KODVAVI
KODVAV WALA
KOTHARI
KOTRI WALA
KOYLANAWALA
KUDIYA
KUTAYA

L

LADHA
LAKHIA
LUNGER WALA
LATH
LATHIA
LAWAI
LEHRI
LOBHIA
LODHAWALA

M

MACHIYARA
MADAR
MANDHAI
MADHA WALA
MADHUPUR WALA
MADINA WALA
MADRASWALA
MAHENTI
MAIMINI
MAYA
MAKNA
MAKRANI
MANAI
MANDVIA
MANGROL WALA
MARSIA
MARWARI
MAYARI WALA
MEHRABPUR WALA
MENDHA
MERCHANT
MESIYA
MILLWALA
MIYAN
MIRAJ WALA
MITTI WALA
MITYARI WALA
MODI
MOON
MOOSANI
MOSAMBI WALA
MOTA
MOTI
MOTIWALA
MOTLIYA
MUFTIA
MUNSHI
MUSHTAQ
MYSOORE WALA

N

NARGOL WALA
NAVTAKIA
NAVADIA
NAVIWALA
NUL
NINI
NIPAINI WALA

O

OSA WALA
OTHA
OZRI

P

PADIDI WALA
PAJOD WALA
PANKHIDA
PAN WALA
PAREKH
PATEL
PHOOL WALA
PIDHA
POLANI
POPAT POTRA
POTHIA WALA
PUNJLA

R

RABDIA
RAFADA WALA
RAILI
RAJA
RATHORE
RAWDA
ROGHDA WALA

S

SABU WALA
SAKAR LAKDI WALA
SAKHI
SAMEGA WALA
SANDHIA WALA
SAMBLA
SANOSRA WALA
SARANPIPRI WALA
SHAIKHA
SARDARGADH WALA
SHERDI WALA
SILAT
SHOLAPUR WALA
SODHA
SOJRA
SON WALA
SOPARI WALA
SORTHIA
SURIYA
SURMAWALA
SURTI

T

TABANI
TANNA
TEE
TEJORI WALA
THANIYANA WALA
TEMLA
THAPLA WALA
TIKAR WALA
TIN WALA
TOLA
TRANSIA

V

VADALA WALA
VADASADA WALA
VAGHER
VAKIL
VARIND
VAROO
VILKARIA

W

WAKRI WALA

Z

ZARA
ZIA

GENEALOGICAL TREE OF BABI DARBARS OF BANTVA-SARDARGADH & MANAVADER

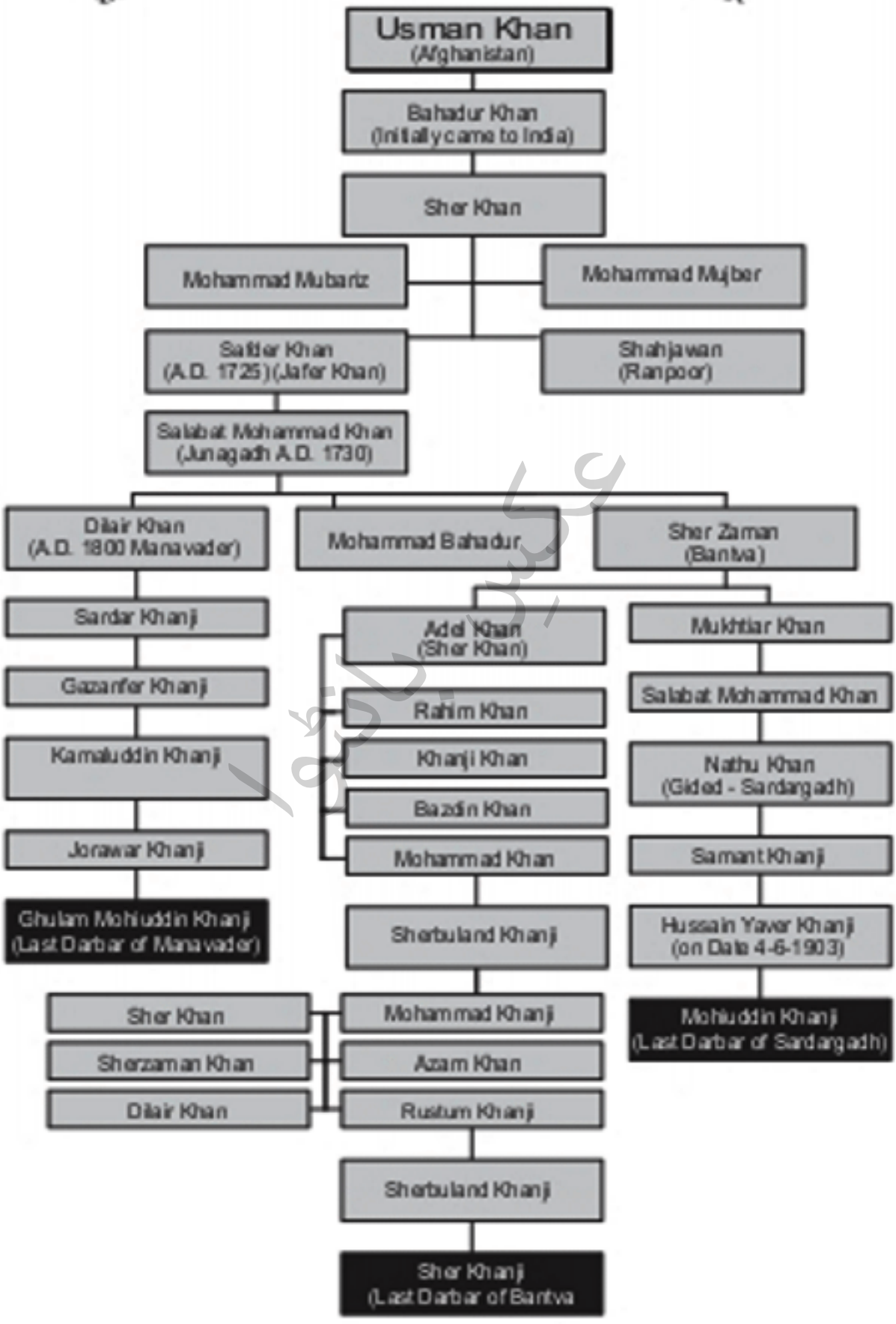

GENEALOGY OF BANTVA'S BABI BARBARS

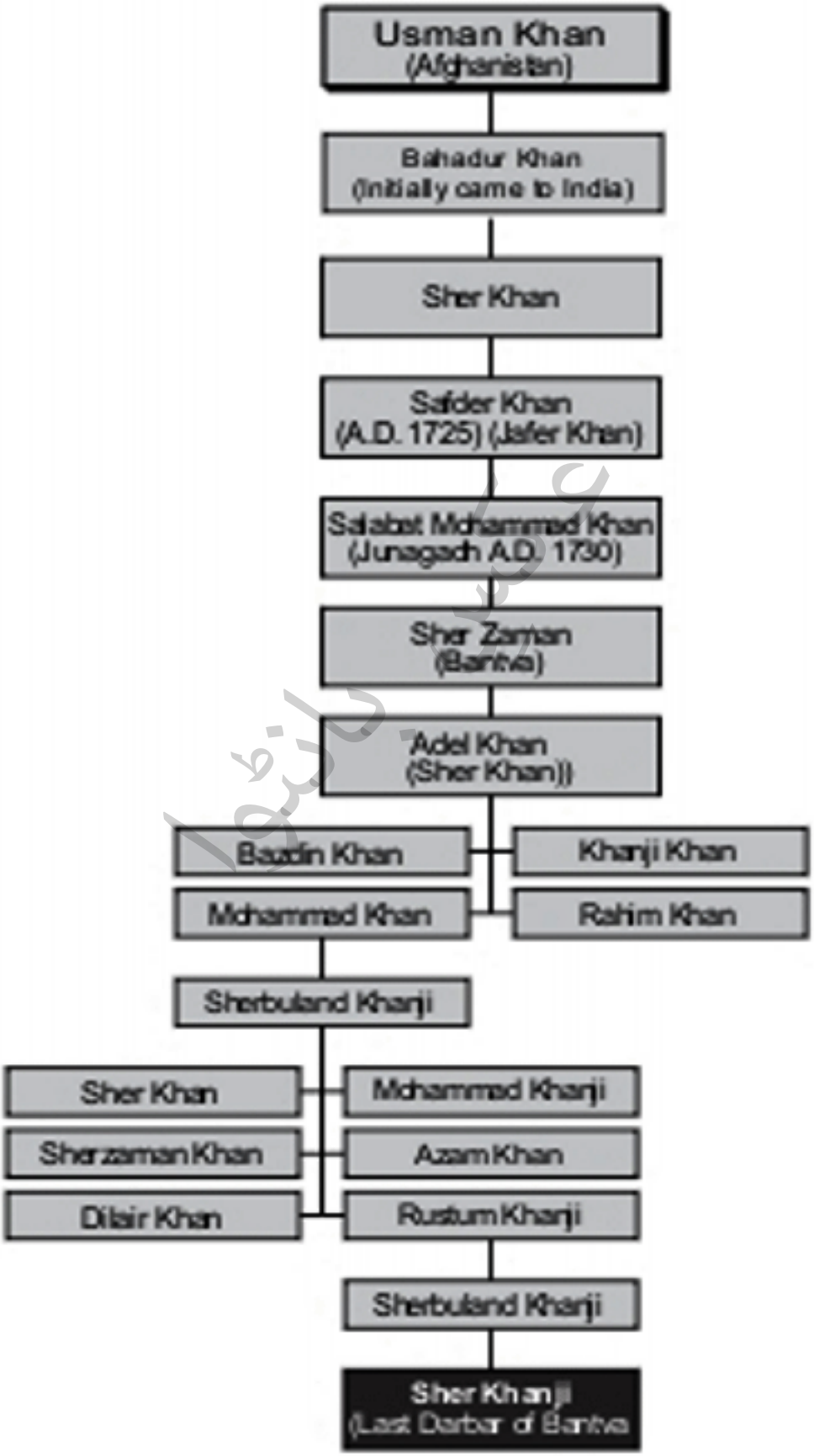

Family Tree of Haji Moosa Lawai

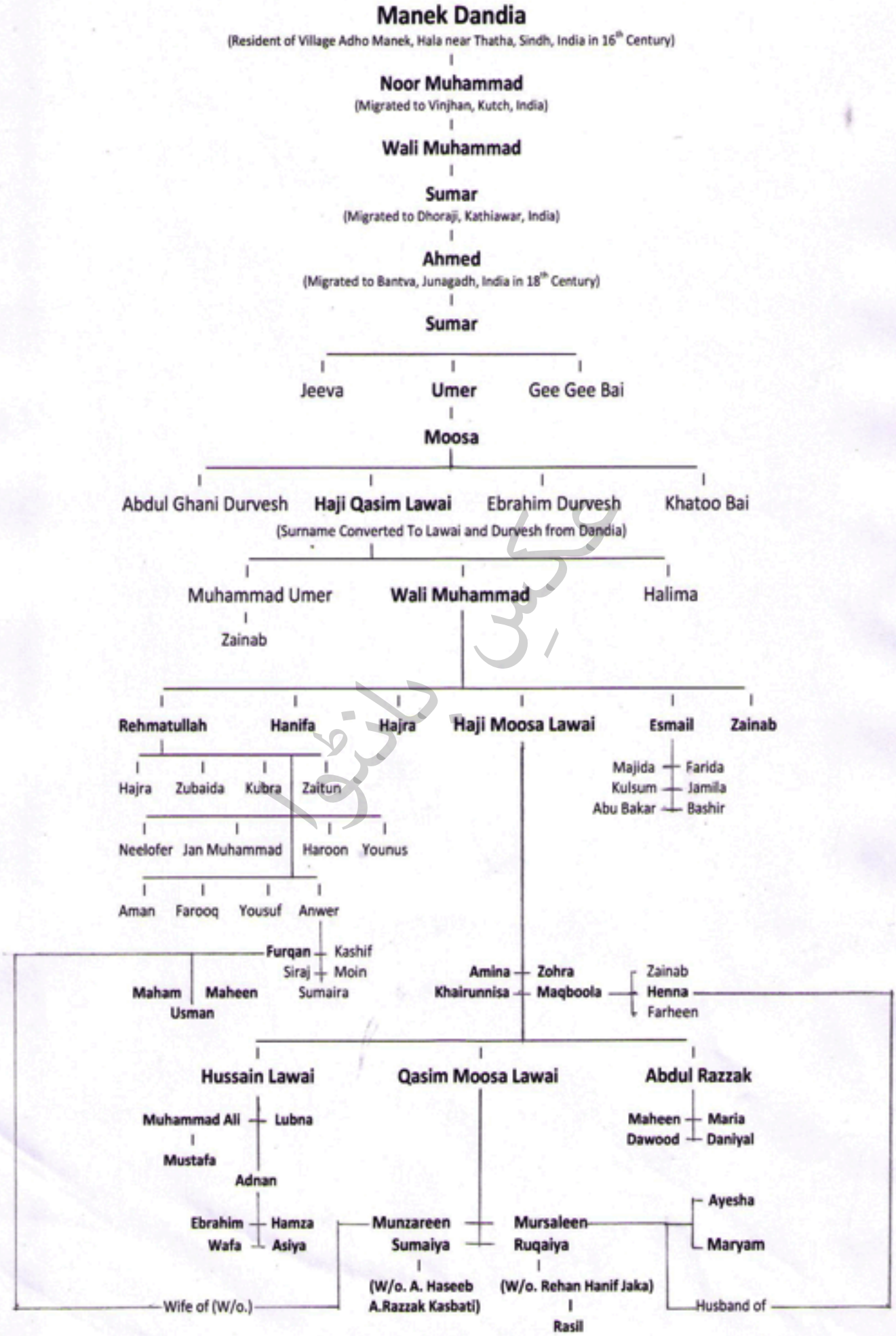

تصاویر

PHOTOGRAPHS SECTION

PHOTOGRAPHS COURTESY:

Abdur Razzaq Thaplawala

Pir Muhammad Deewan

Abdul Shakoor Aba Umer Dada

Umer Abdul Rehman

Another outer view of Two story Lawai House (Known as Lawai Pado) in Bantva. The adjecent big gate on the left is gate of Haji Qasim Lawai Lati (Timber Godown) Picture taken after fall of Bantva in 1949

An interior view of Lawai House (Known as Lawai Pado) in Bantva.
Picture taken after fall of Bantva in 1949

Another outer view of Two story Lawai House (Known as Lawai Pado) in Bantva. The adjecent big gate on the left is gate of Haji Qasim Lawai Lati (Timber Godown) Picture taken after fall of Bantva in 1949

The big gate shown in the picturte is the gate of Grand Father Haji Qasim Lawai Lati (Timber Godown) Picture taken after fall of Bantva in 1949

بانٹوا میں مسلم لیگ فنڈ ریزنگ کے موقع پر نامور مومن سماجی رہنما سلیمان پیر محمد دیوان
قائداعظم محمد علی جناح کو نوٹوں سے بھرا بیگ پیش کر رہے ہیں۔

بانٹوا میں مسلم لیگ فنڈ ریزنگ کے موقع پر صدیق داؤد، سلیمان پیر محمد دیوان اور حاجی حبیب سیٹھ کلکتہ والا
کا قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ گروپ فوٹو

بانٹوا میں حاجی پیر محمد قاسم چیریٹیبل ہسپتال کی افتتاحی تقریب کے موقع پر قائداعظم کا نواب مانا ودر، شیر خانجی اور دیگر معزز میمن شخصیات کے ساتھ گروپ فوٹو

بانٹوا میں مدرسہ اسلامیہ کے میدان میں جلسہ عام کا ایک منظر، قائداعظم کے ساتھ حسین قاسم دادا، حاجی حبیب، حاجی پیر محمد اور محمد علی باپو تشریف فرما ہیں۔

بانٹوا میں مٹاری پیر کی درگاہ، دائیں جانب جمعہ مسجد دکھائی دے رہی ہے۔

بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام صفورا بائی میمن گرلز بورڈنگ ہاؤس کی افتتاحی تقریب 10 اکتوبر 1971ء کو ہوئی اس موقع پر حسین داؤد پارکھ، سیٹھ حاجی عمر طیب ٹی، حاجی موسیٰ لوائی اور عبدالغفار نوٹا کی یادگار تصویر

میمن ایجوکیشن بورڈ کے زیر اہتمام ایک تقریب میں حاجی موسیٰ لوائی، محمد عبداللہ اور عبدالستار بھورا تشریف فرما ہیں۔

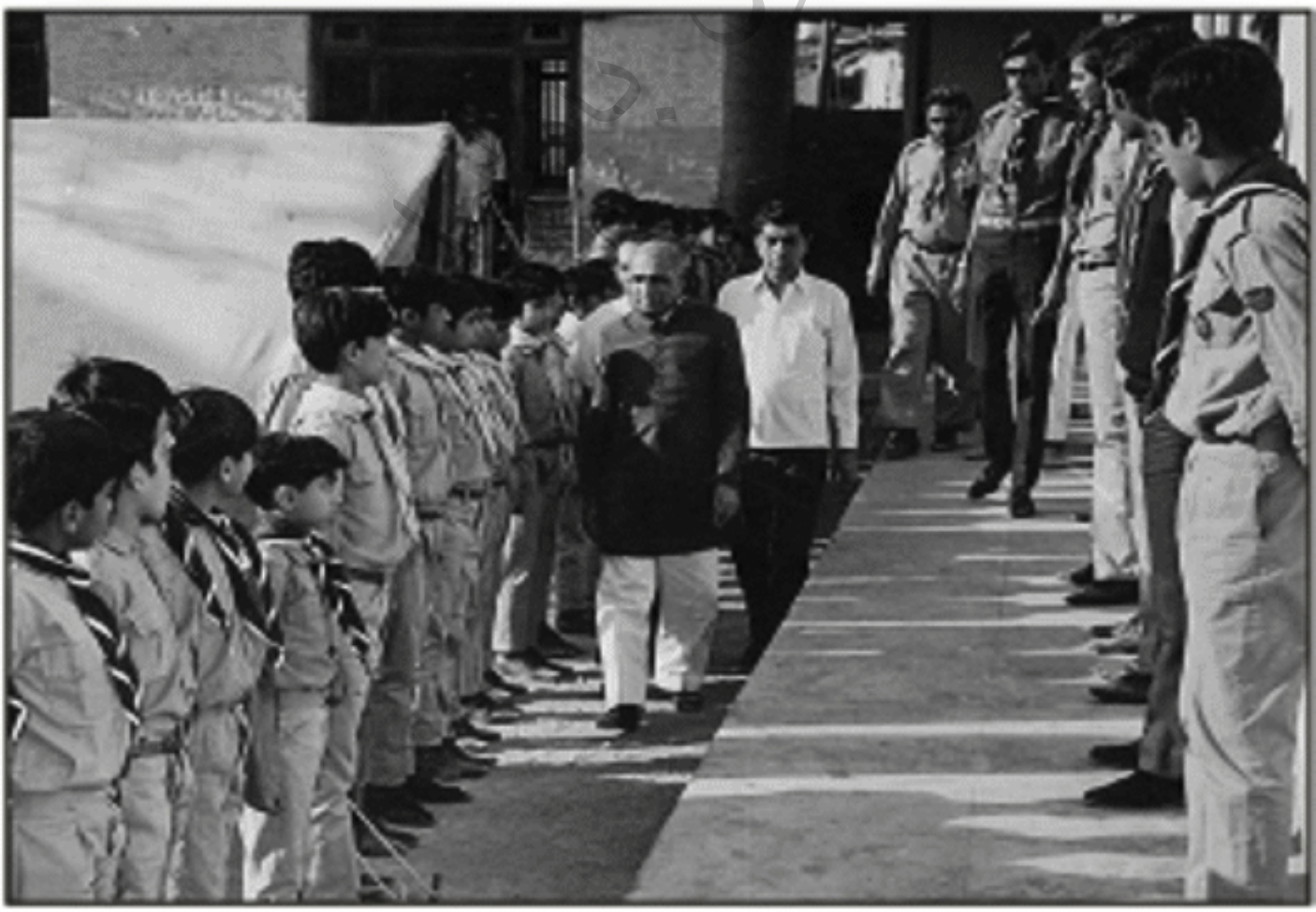

میمن ایجوکیشن بورڈ کے اعزازی جنرل سیکرٹری حاجی موسیٰ لوائی کی اسکول اسکاؤٹ کا معائنہ کرتے ہوئے یادگار تصویر

محترمہ رقیہ حاجیانی بانٹوا نگر میں کدال چلا کر رقیہ حاجیانی ہائی اسکول کا سنگ بنیاد رکھ رہی ہیں،
عکس بانٹوا کے مصنف حاجی موسیٰ لوائی، حاجی شریف بلوانی اور پیر محمد دیوان تصویر میں نمایاں ہیں۔

رو قیہ حاجیانی ہائی اسکول کے سنگ بنیاد رکھے جانے کے موقع پر حاجی موسیٰ لوائی، رقیہ حاجیانی،
شریف بلوانی، ہارون بلوانی، عبدالغفار نوتا کیا، پیر محمد دیوان اور عبدالرزاق دیوان کا گروپ فوٹو۔

راجکوٹ میں میمن بورڈنگ ہاؤس، اس عمارت کے باعث کئی میمن اکابرین علم کے زیور سے آراستہ ہوئے۔

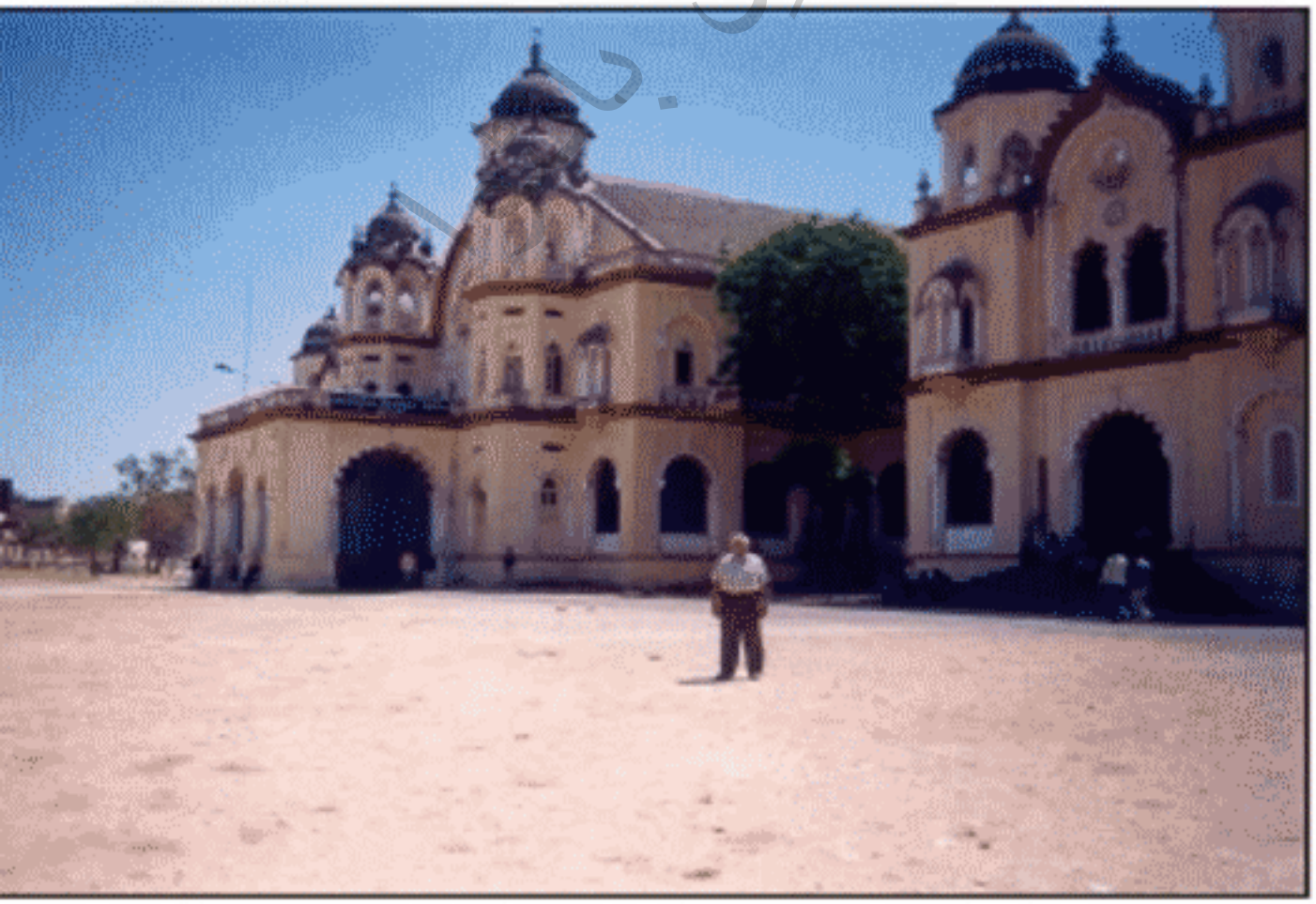

جوناگڑھ شہر میں بہاؤالدین کالج جو برصغیر میں مسلمانوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا مرکز رہا ہے۔

بانٹوا کی ایک سڑک کا منظر، پس منظر میں حاجی حسین قاسم دادا کی تعمیر کردہ مسجد ہے۔

بانٹوا جیم خانہ کا ایک منظر جس سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم دور میں بھی بانٹوا پڑھے لکھے اور باذوق لوگوں کا شہر تھا۔

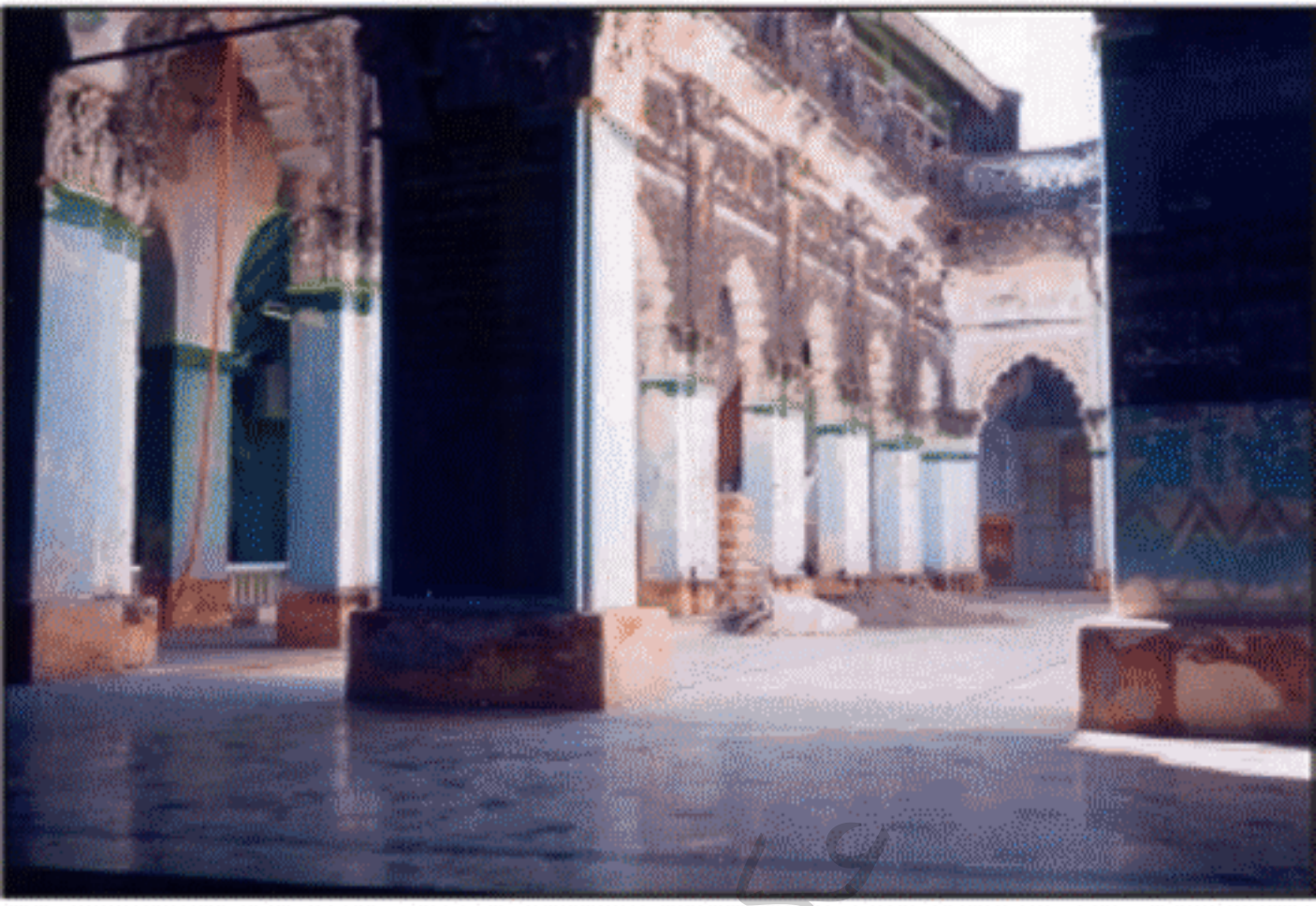

بانٹوا کی جمعہ مسجد کا اندرونی منظر۔ امتداد زمانہ نے اس کی خوبصورتی ماند کردی ہے۔

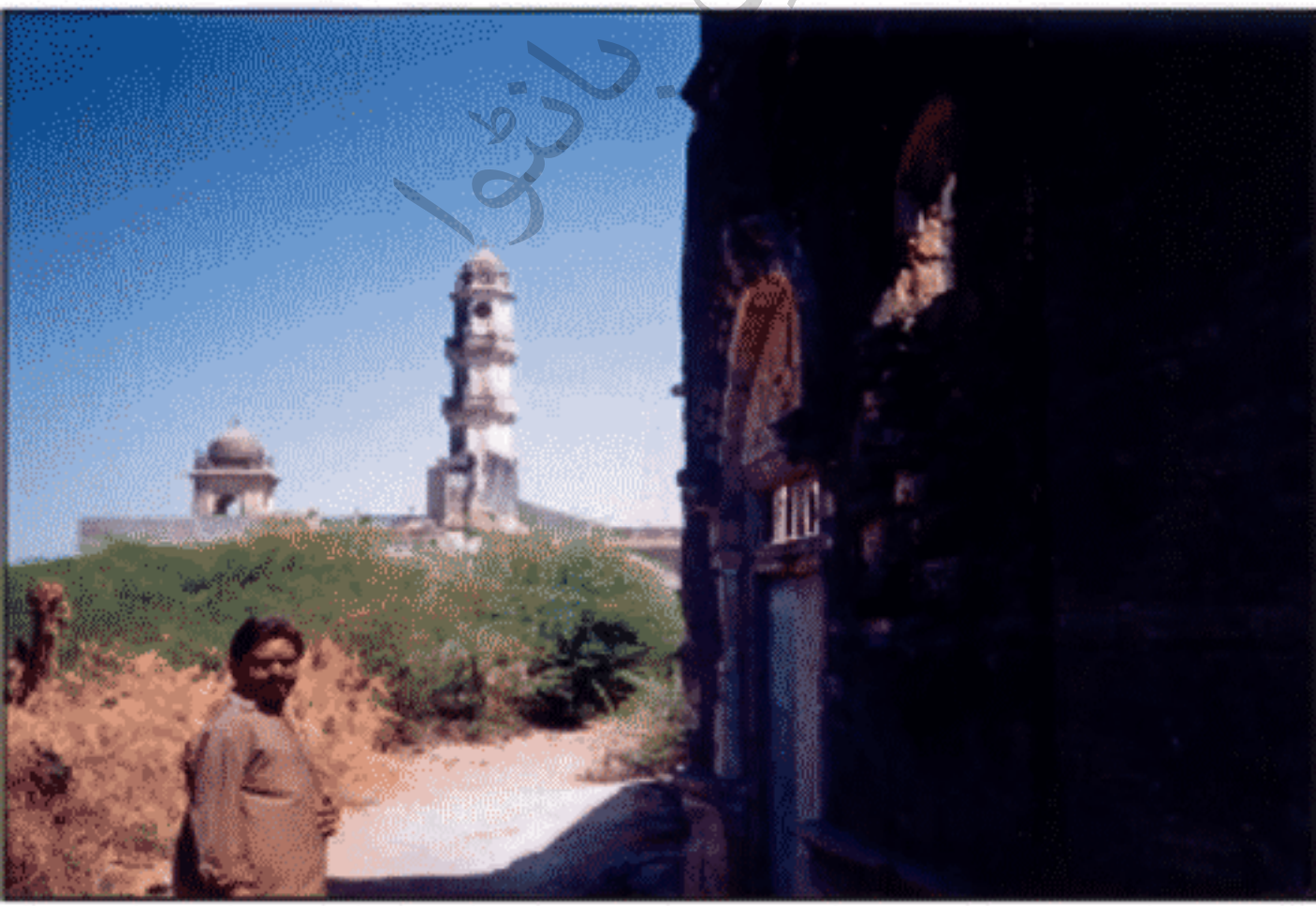

زاپا کی اندرونی حدود میں واقع بانٹوا کی ایک سڑک۔ اب اس کی رونقیں ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔

بانٹوا کا جواہر روڈ، سونے چاندی کی تجارت کا یہ قدیم مرکز ہے۔

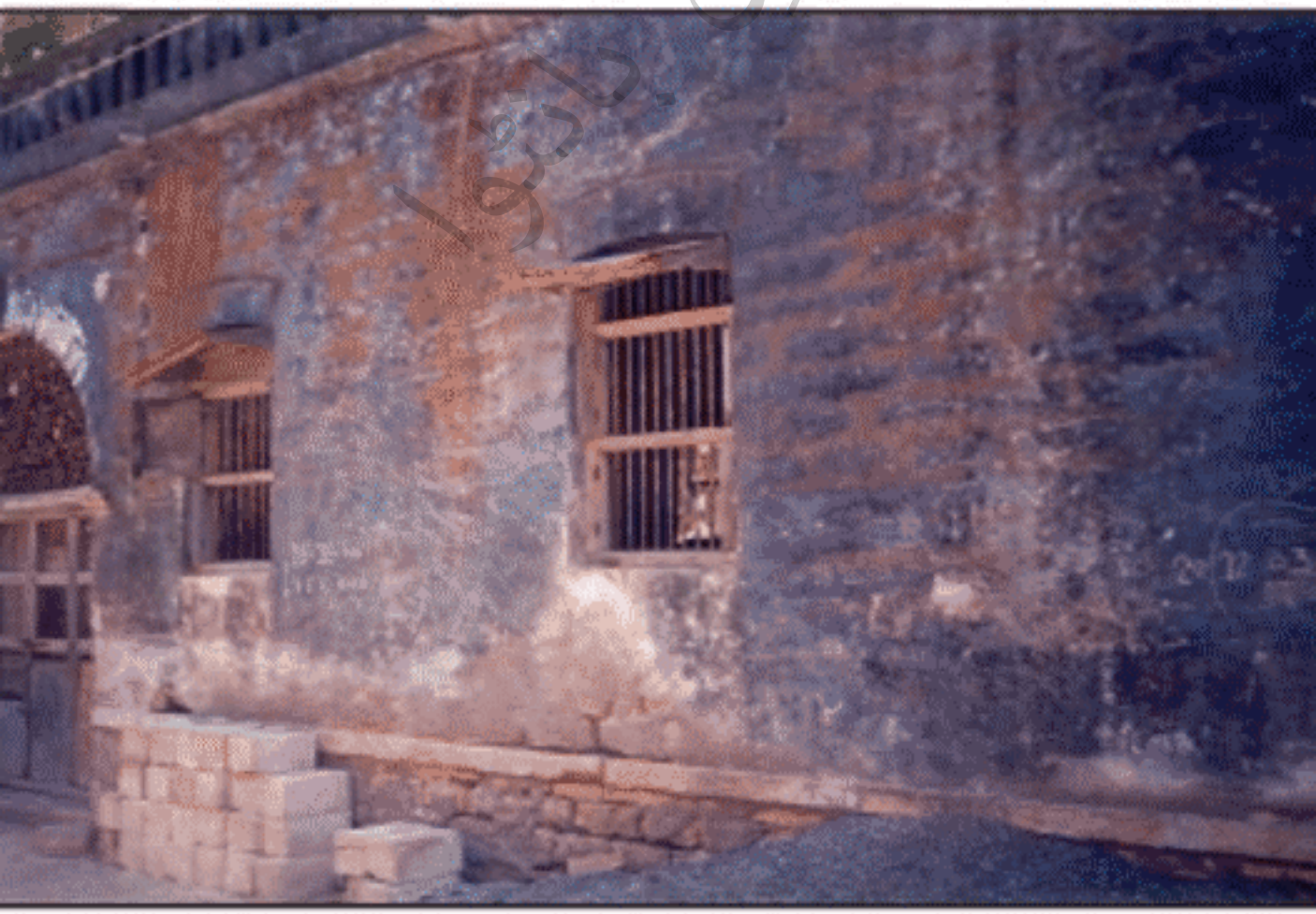

بانٹوا جماعت خانہ (جماعت جوڑیلو) کا ایک منظر، اس جماعت خانے میں سماجی و فلاحی کام کیے جاتے تھے۔

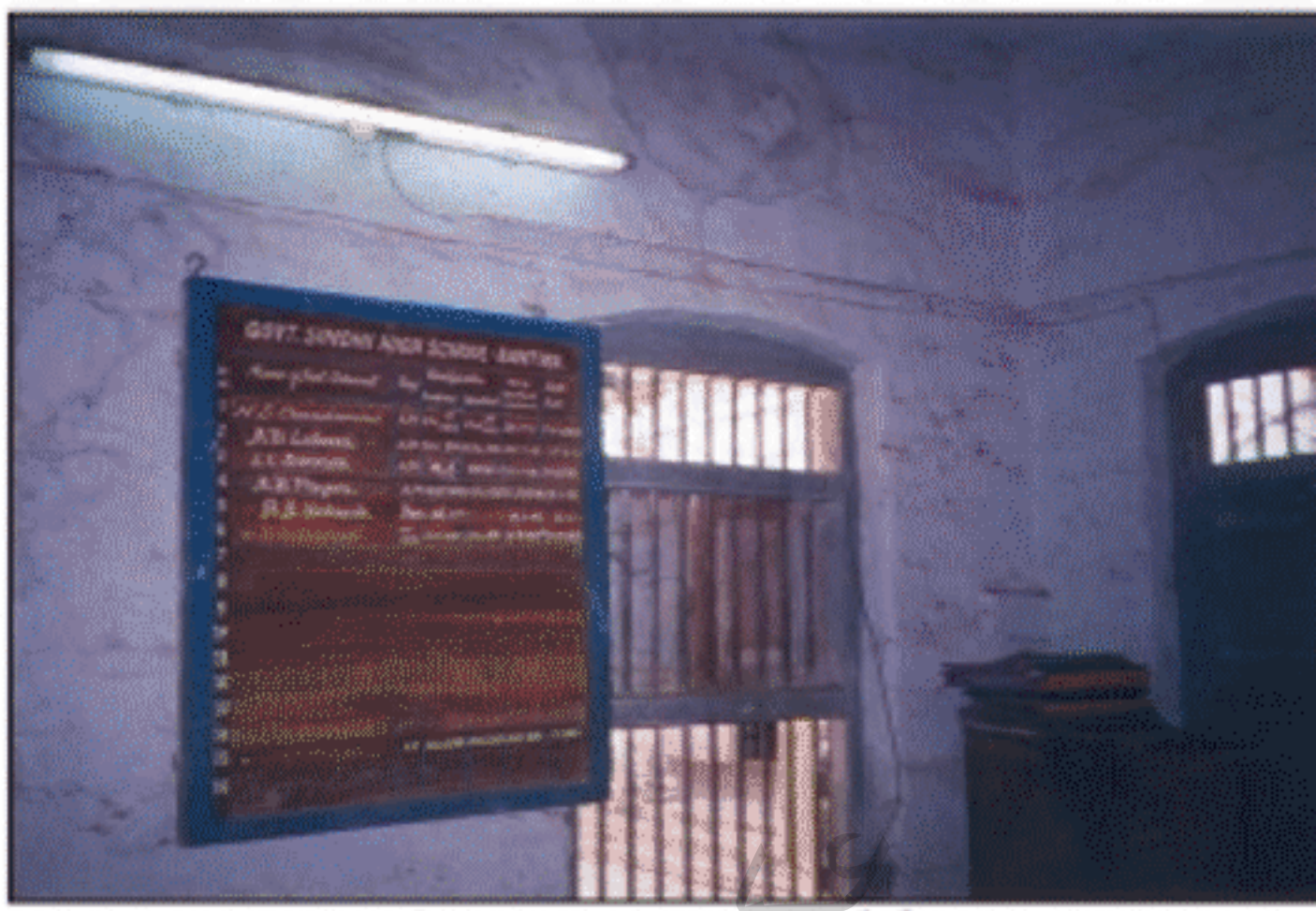

بانٹوا جماعت خانے میں ہائی اسکول، میمن برادری کے اکابرین اس اسکول سے مستفید ہوتے تھے۔

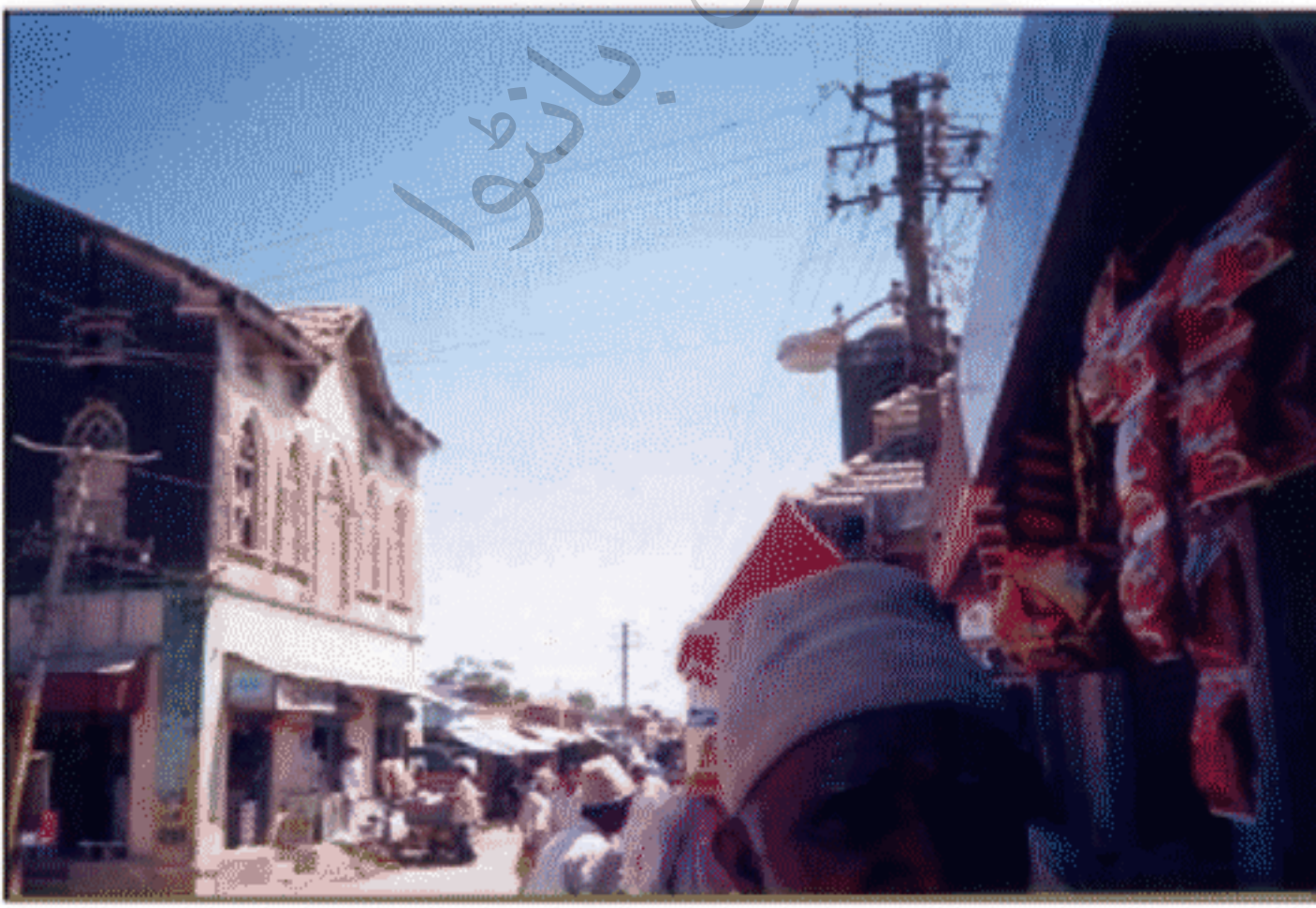

محمڈن لائبریری کا ایک بیرونی منظر، علم وفن کا اہم مرکز۔

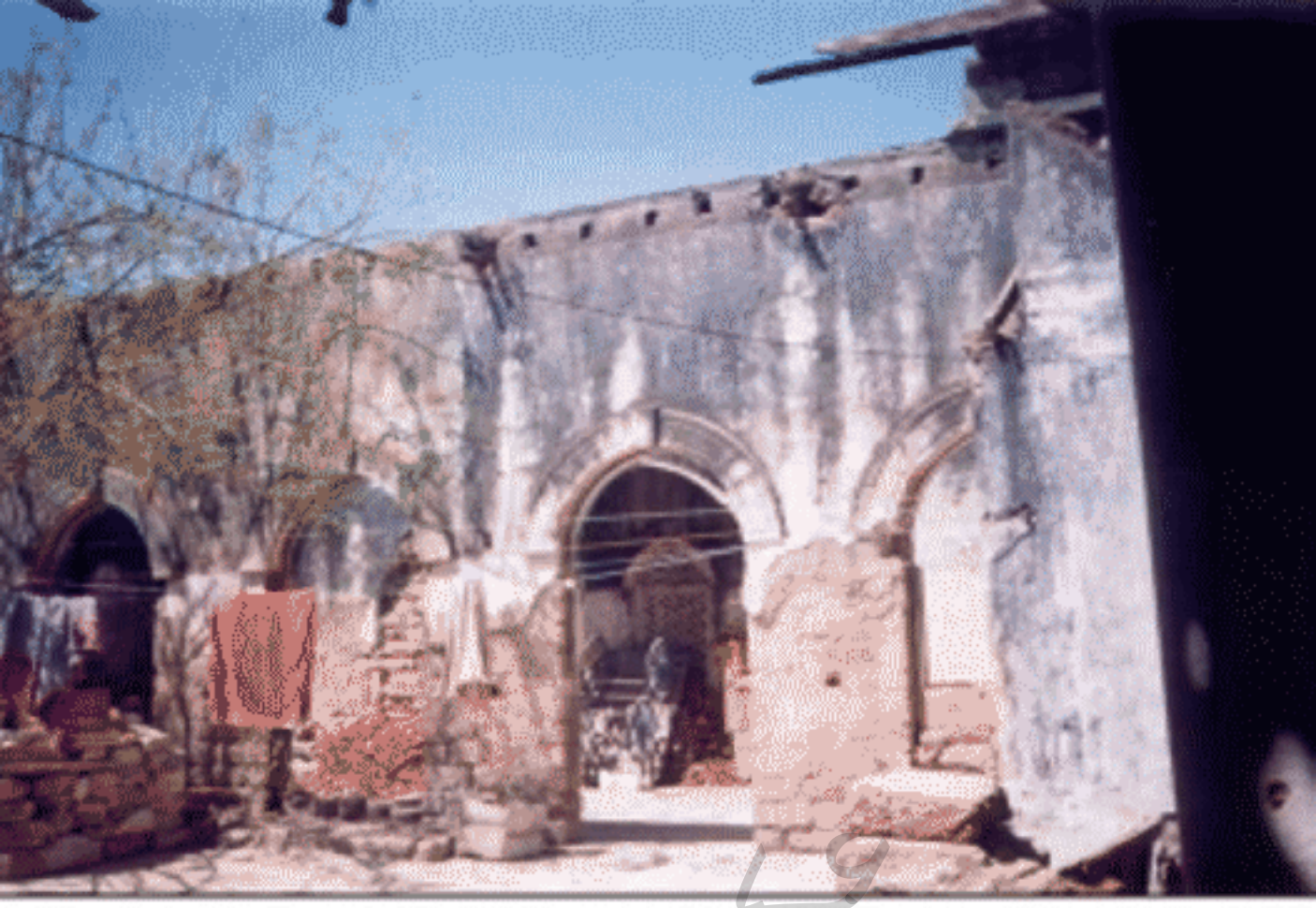

حسین قاسم دادا کی مسجد کا اندرونی منظر جو آج زبوں حالی کا شکار ہے۔

بانٹوا کا یتیم خانہ جس میں اب لڑکیوں کا اسکول قائم کر دیا گیا ہے۔

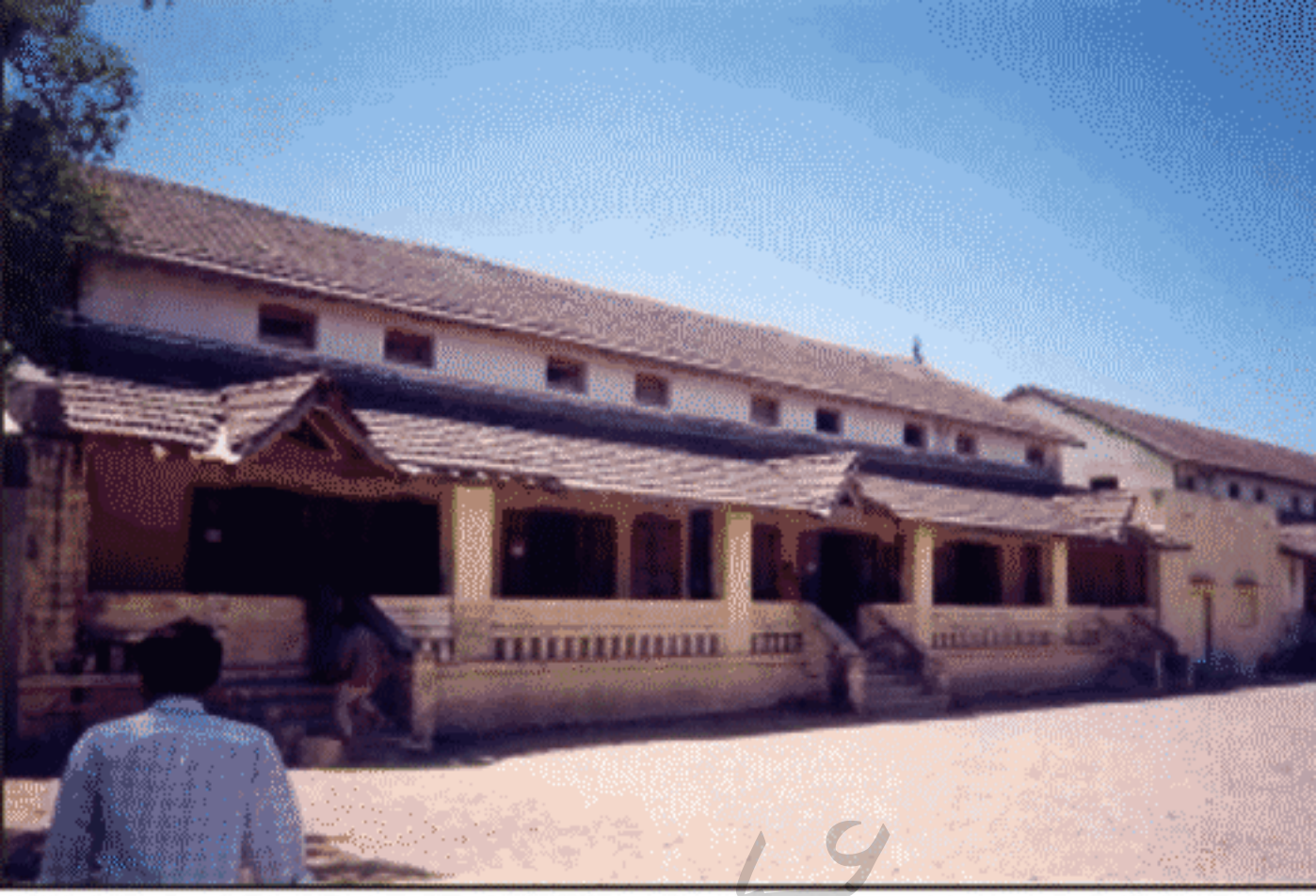

بانٹوا مدرسۃ الاسلامیہ کا ایک خوبصورت بیرونی منظر، قدیم فن تعمیر کا ایک دلکش شاہکار

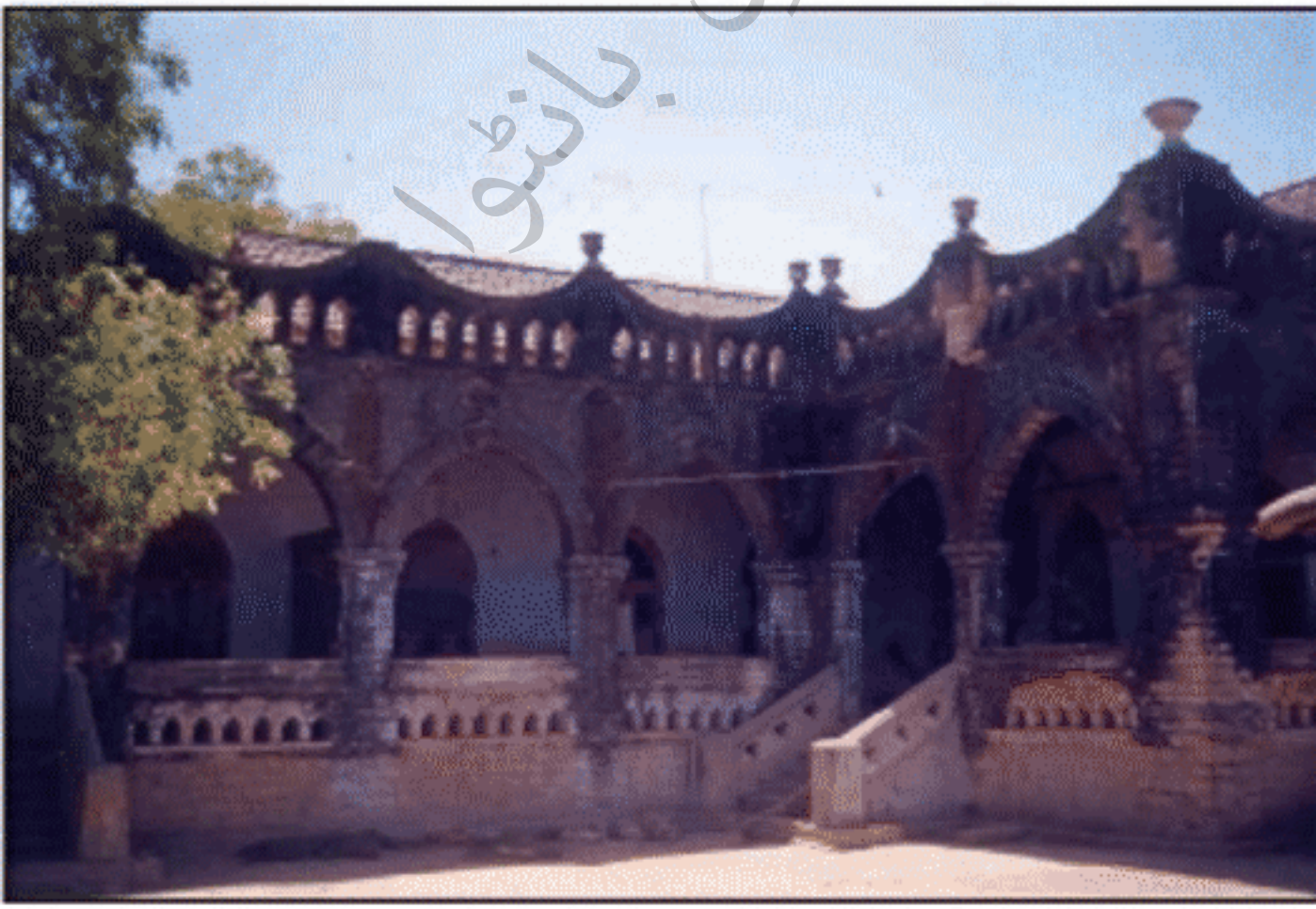

حاجی پیر محمد کلکتہ والا ہسپتال جسے اب لائبریری میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

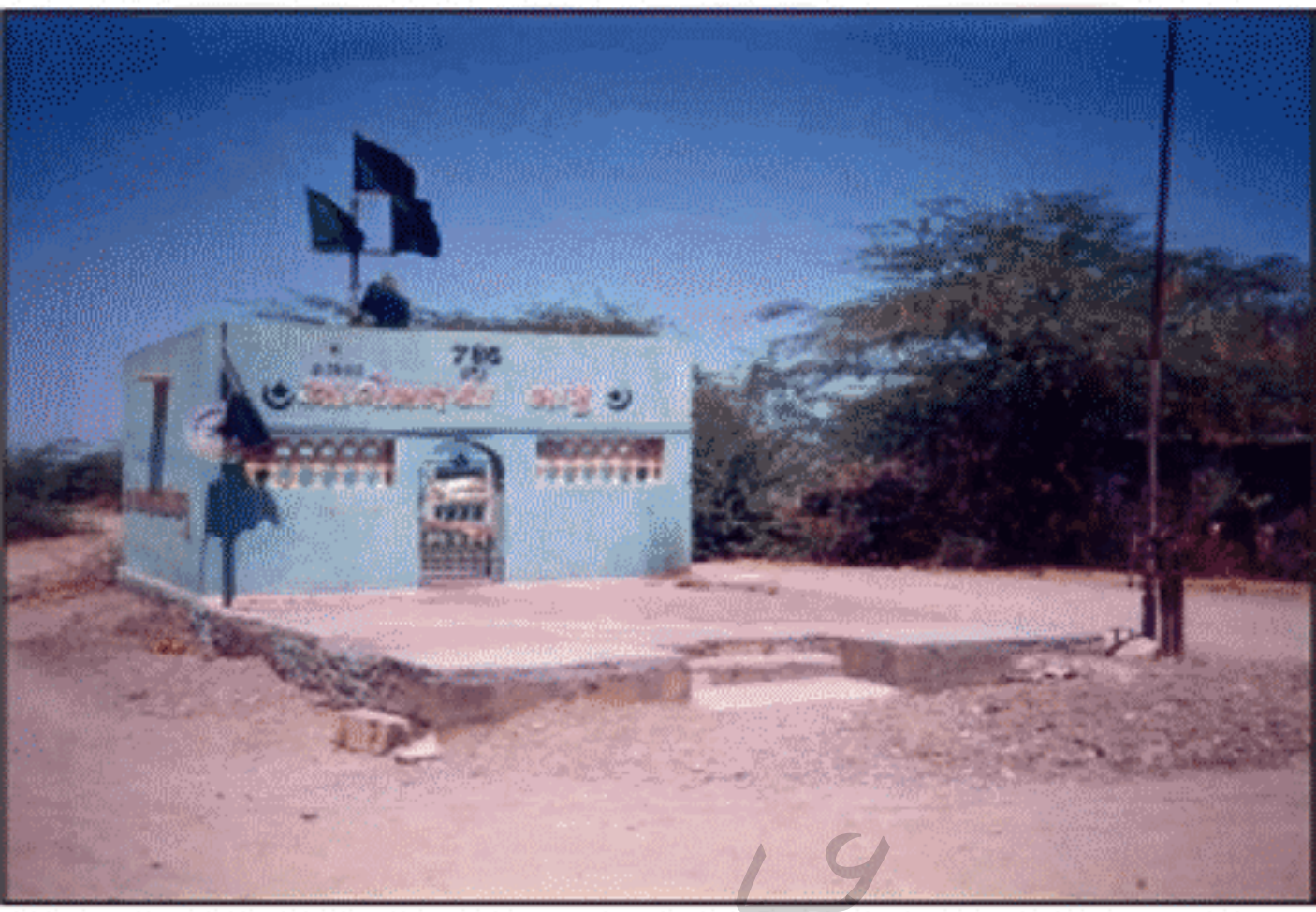

بانٹوا میں حضرت گیبن شاہ باپو کی درگاہ کا ایک منظر

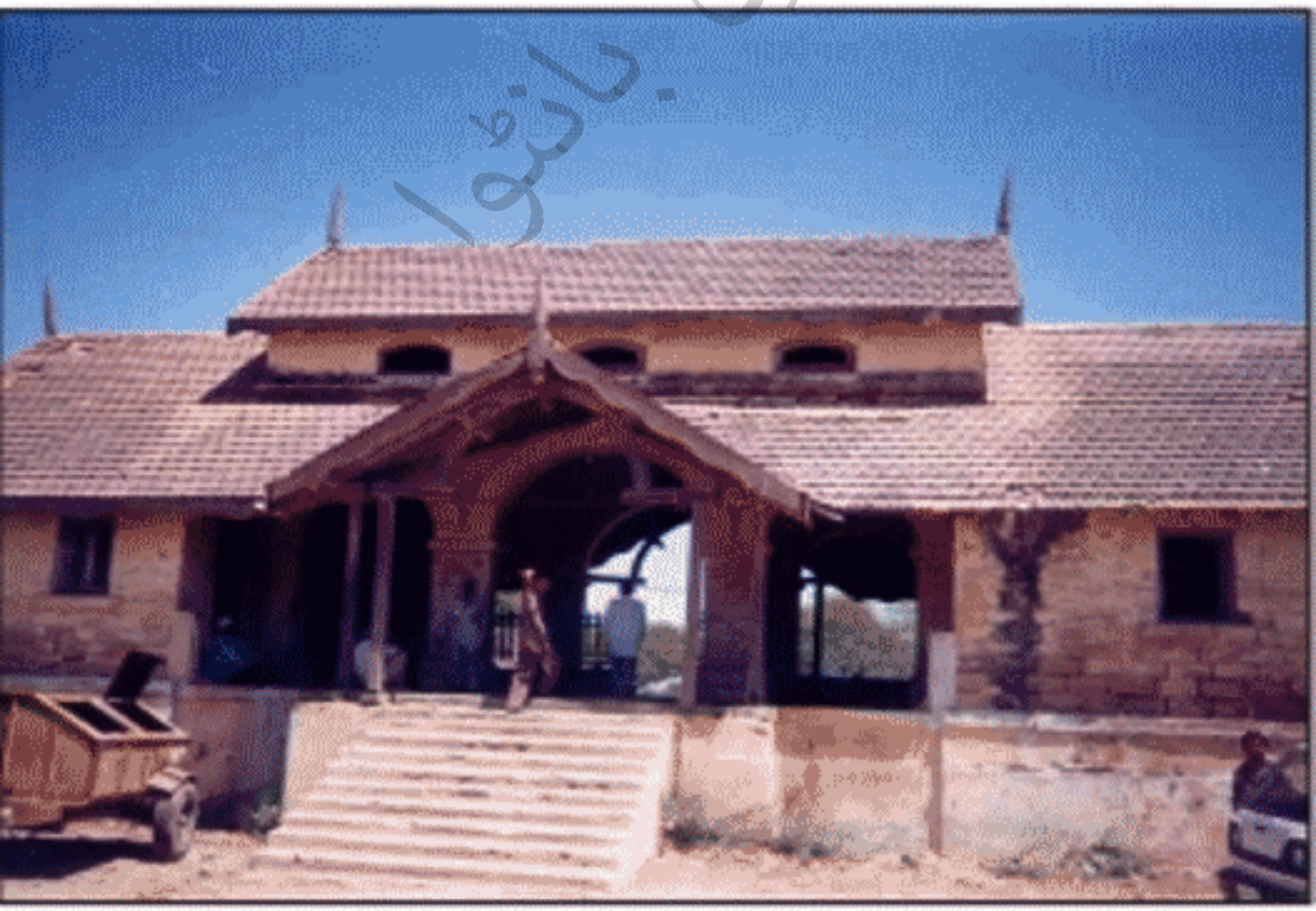

بانٹوا کے تاریخی ریلوے اسٹیشن کا ایک منظر اب یہاں ریل نہیں چلتی لیکن گزرے وقتوں کی یادگار موجود ہے۔

بانٹوا ریلوے اسٹیشن کا ٹکٹ گھر، یہاں ادائیگی کر کے لوگ دور دراز کا سفر کیا کرتے تھے۔

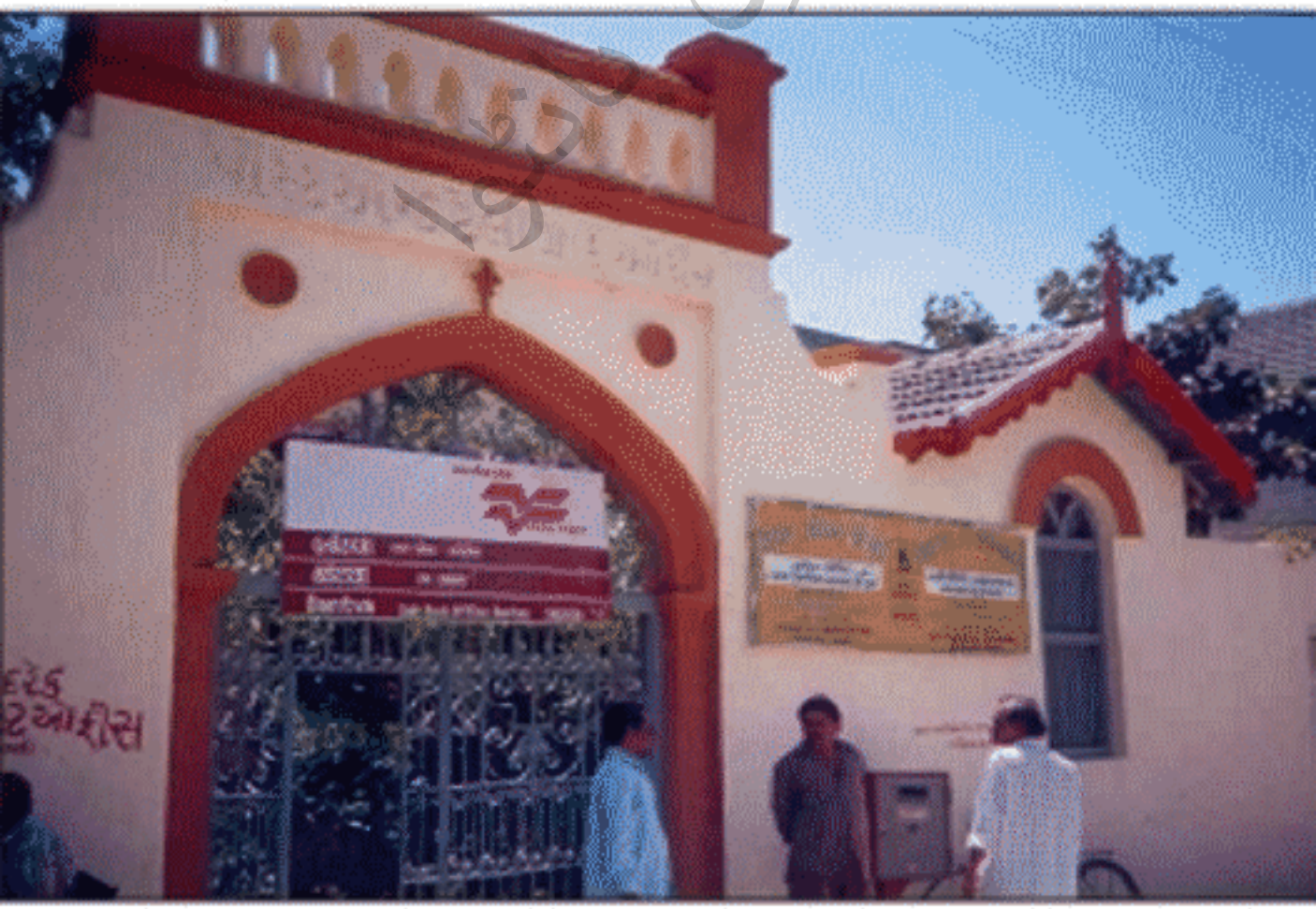

بانٹوا میں اسٹیشن روڈ پر واقع نیا ڈاکخانہ

حاجی پیر محمد مسجد کا ایک دلکش اندرونی منظر

بانٹوا بازار کی ایک حالیہ تصویر

بانٹوا ٹاور، جو شہر بانٹوا کی پہچان تھا، یہ آج بھی اپنی پوری آب و تاب اور شان سے کھڑا ہے۔

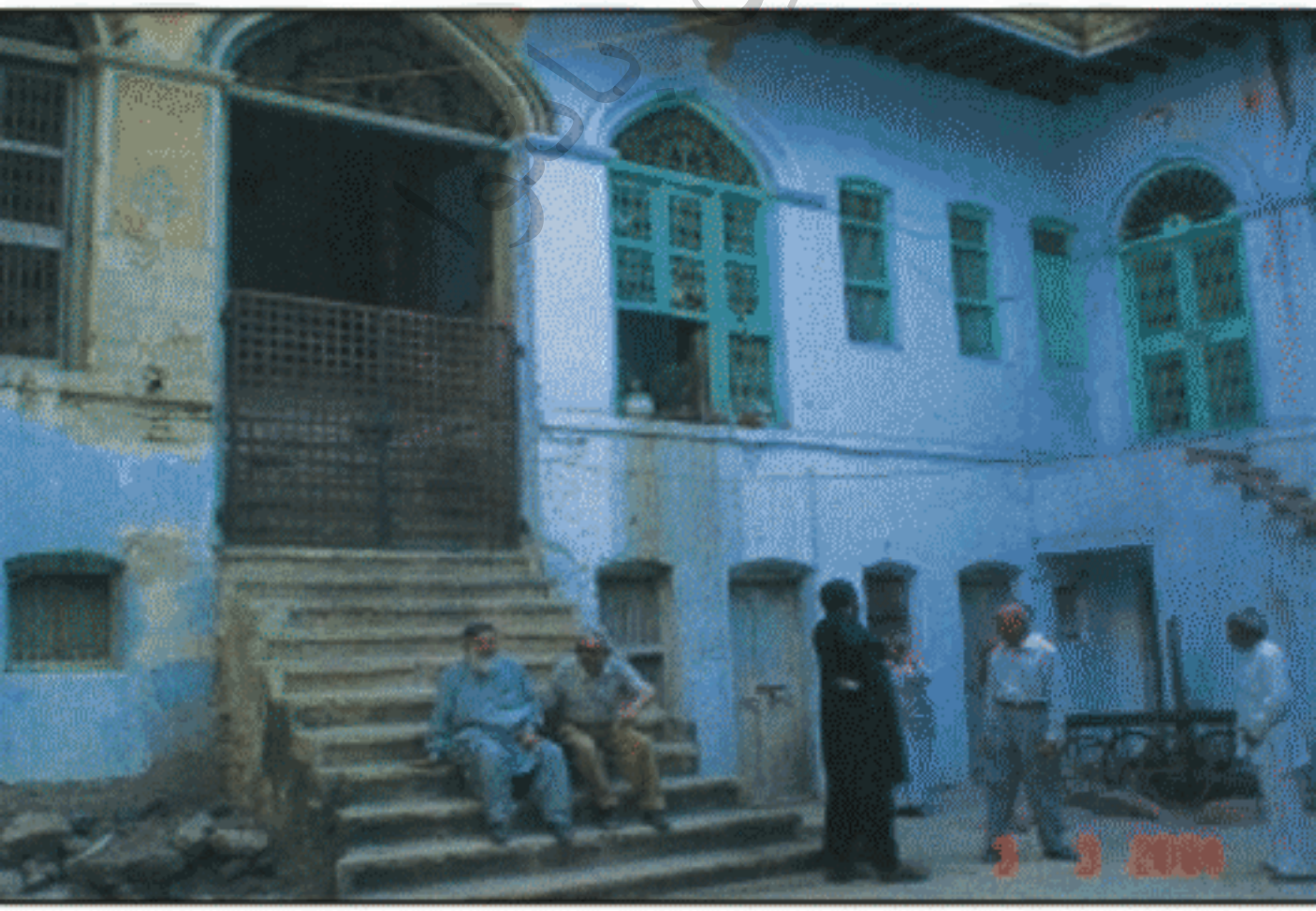

بانٹوا شہر میں عبدالشکور ابا عمر ڈاڈا اپنے قدیم مکان میں سیڑھیوں پر بیٹھے دکھائی دے رہے ہیں۔

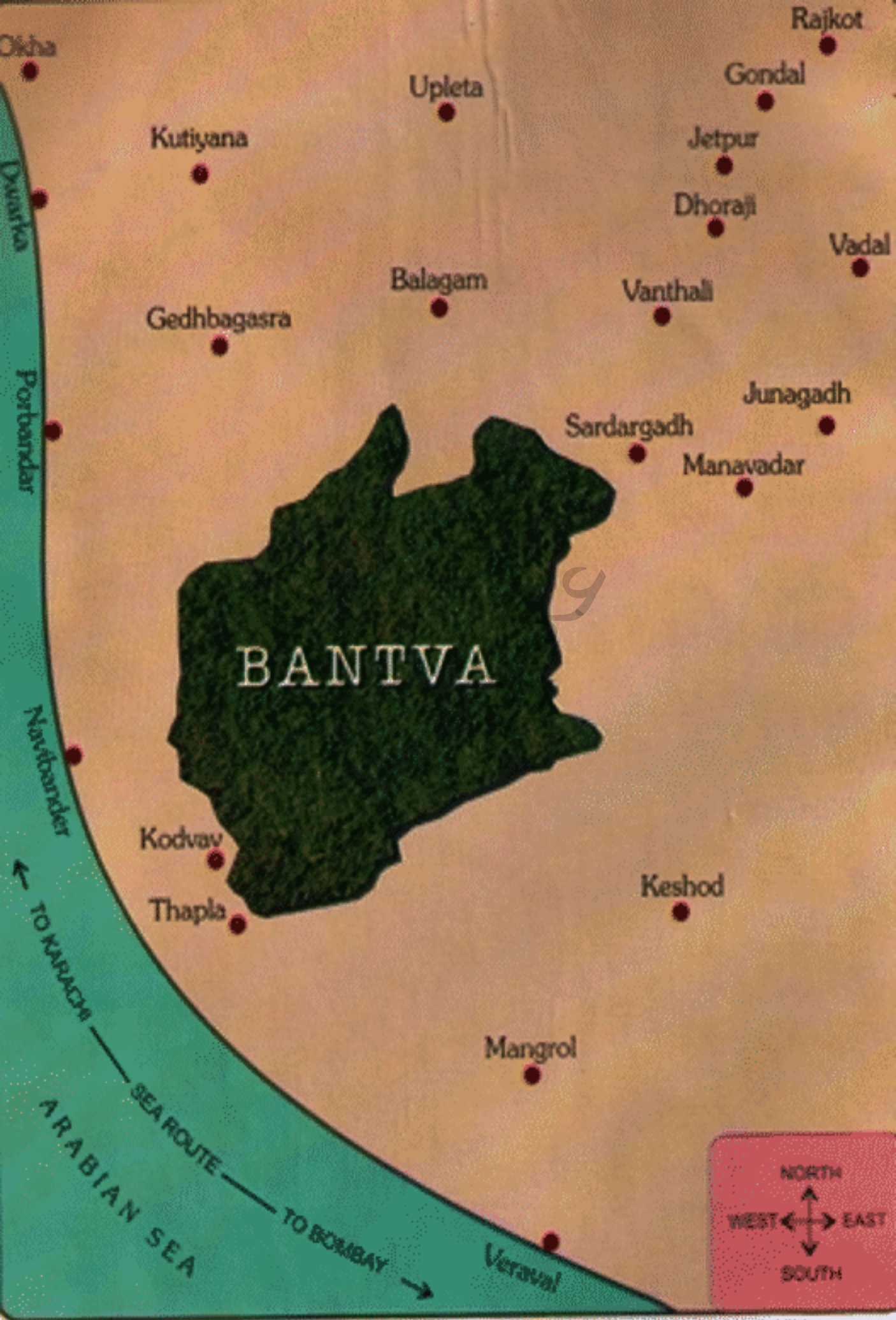

MAP OF BANTVA AND ADJACENT AREAS

MAP OF BANTVA-AS IT WAS IN 1947

ADOPTED + MODIFIED BY

Abdur Razzaq Thaplawala
&
Abdul Aziz Suleman Khanani (Machhiyara)

PRINTED FOR FREE DISTRIBUTION
BY
ABDUR RAZZAQ THAPLAWALA
Ph: 4534235

Bantva is located at 21° 28' 60N and 70° 4' 60E, at an altitude of 20 meters. Prior to 1947 partition of India, Bantva was a princely state of Bantva Manavadar founded in 1760 and locally ruled until Feruary 1948 by Nawab Mo'in ad-Din Gholam Khan. Prior to partition, the population of Bantva was approximately 20,000; 80% of its population was Memon. As of the 2001 India census, Bantva has population of 15,216. Males constitue 52% of the population and females 48%. Bantva has an average literacy rate of 69%, higher than the national average of 59.5%, with 57% of the males and 43% of females literate. 12% of the population in under 6 years of age.

MAP OF
JUNAGADH STATE
AND ADJACENT AREAS
Courtesy:
Abdur Razzaq Thaplawala
GUJARAT
KATHIAWAR
JAMNAGAR
JUNAGADH
BARODA
BHAVNAGAR
GULF OF KUTCH
ARABIAN SEA
SEA ROUTE KARACHI TO JUNAGADH 300KM AND BOMBAY 483 KM
To Karachi
To Bombay
TO AHMADABAD
TO SURAT
SURENDRANAGAR
Bhuj
Anjar
Mandvi
Morbi
Tankara
Okha
Dwarka
JAMNAGAR
RAJKOT
Gondal
Jetpur
Dhoraji
Upleta
Porbandar
Kutiyana
Bantva
Manavadar
JUNAGADH
Keshod
Mangrol
Veraval
Navibandar
Amreli
Kundla
Mahuva
Rajula
Zafarabad
Port Albert Victor
Diu Port
Prachi
Sinor
Dholka
Bharuch
Jasdan
NORTH
SOUTH
EAST
WEST
PAKISTAN
INDIA
Karachi
Junagadh
Bombay

A Devoted Samaritan

LATE HAJI MOOSA LAWAI

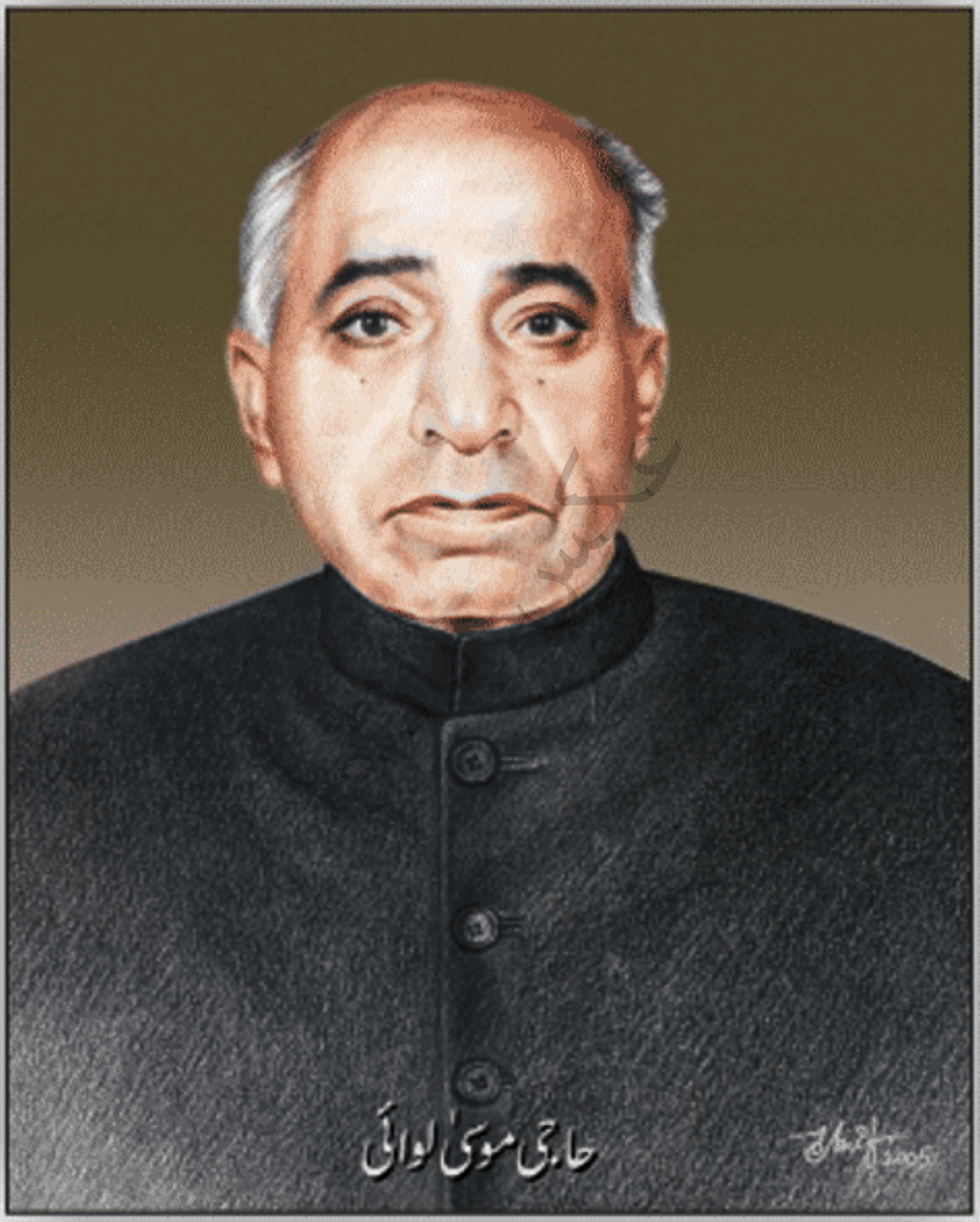

میرے فن کا دائرہ پھیلے گا میرے بعد بھی
پھول مرجھائیں تو خوشبو کا سفر رکتا نہیں

PROMINENT SONS OF
Late Haji Moosa Lawai

HUSSAIN MOOSA LAWAI

QASIM MOOSA LAWAI

DR. A. RAZZAK MOOSA LAWAI

ABOUT THE AUTHOR

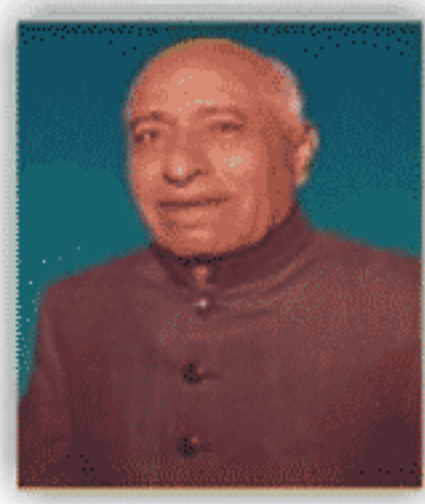

HAJI MOOSA LAWAI S/o. Haji Wali Muhammad Lawai was born on 1st January 1918 at Bantva, he started his social activities since younger age, he was hon. Gen. Secretary of Veraval Timber Market Association in Veraval till 1949. He has contributed his services to help Immigrant Memon Families from India to Pakistan through Veraval Port at the time of partition of India

After migration from India he started his own native business of timber at Timber Market at Karachi, soon he was selected Hon. Gen. Secretary of Timber Market and rendered his services for long time, he was also member of managing committee of Federation of Chamber of commerce.

His other social services started from 1952 when along with Mr. Suleman Bhura, he founded Madressa -E- Islamia Schools at (1) Khori Garden, (2) G. Allana Road (3) Kharadar and (4) F.B. Area for boys under the Management of Memon Educational Board. He remain Hon. Gen. Secretary and Vice President for 45 years till his expiry.

He remains as Hon. Gen. Secretary of Bantva Memon Jamat in it's earlier stage for long time and introduced revolutionary changes for the benefit's of society in this organization. He was also Hon. Gen. Secretary and Vice President of Bantva Anjuman Himayate Islam, Bantva Memon Khidmet

Committee, Moosa Lawai Foundation and Bantva Rahat Committee.

His real services are for the benefits of orphan and helpless minor girls, when he started Safurabai Memon Girls Boarding House for orphan and helpless girls with the help of some friends and specially Mr. Haji Muhammad Umer Tayub T, (a renowned philanthropist from Bantva who had donated a bunglow measuring 2300 square yards at PECHS Karachi) under the Management of Bantva Educational Society. He remains lifetime President of the society till his last breath.

Haji Moosa Lawai has rendered his life for the benefits of poor and needy persons specially students and orphan girls from Memon community. Daily visit at schools and girls boarding house till the age of 80 years has given us the lesson that social services has no retirement age. He always was of the view and he always quote that (1) "Do not stop working till last breath ". (2) Blessings from help less persons add life and strength in the body and soul. (3) Social workers have no retirement age.

He has written a book named " Akse Bantva " (Reflections of Bantva), recently published by his son Mr. Qasim Lawai in Urdu language through Moosa Lawai Foundation.

After long social services he expired on 20th October 1997 leaving behind same quality son Mr. Qasim Lawai who is looking after and managing all leftover work started by him along with other new organizations, with the hope that he will not only keep the pace of work started by the father on right track but will keep it at its highest level.

COURTESY:

The book "WHO'S WHO IN MEMON COMMUNITY" complied by MR. USMAN BATLIWALA.

ABDUL RAZZAQ YAQOOB (ARY)

حاجی عبدالرزاق یعقوب

صدر : ورلڈ میمن آرگنائزیشن
چیئرمین : اے آر وائی گروپ

بانٹوا ریاست جونا گڑھ کا ایک اہم شہر اور میمن برادری کا بڑا مرکز تھا۔ قیام پاکستان سے قبل بانٹوا میں سونے چاندی کی ریل پیل تھی اور اس دولت نے تحریک پاکستان کو بھی زبردست طاقت دی۔ بانٹوا کے میمن اور گجراتی تاجر پورے انڈیا میں سینکڑوں تجارتی برانچوں کو کنٹرول کرتے تھے اور ان کی تجارت برما اور افریقی ممالک سمیت دنیا بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ انڈیا کے دس بڑے امپورٹرز میں سے تین کا تعلق بانٹوا سے تھا۔ بانٹوا سے تعلق رکھنے والے میمن اکابرین نے تحریک پاکستان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ بانٹوا میمن برادری کے ممتاز سماجی رہنما حاجی موسیٰ لوائی کی کتاب "عکس بانٹوا" مختصر مگر جامع ہے۔ اس تاریخی داستان میں انھوں نے اپنی خوبصورت یادوں کو بھی سمیٹا ہے۔ جسے پڑھ کر نئی نسل اپنے اسلاف کے بارے میں بہت کچھ جان سکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کتاب کو پاکستان کی تمام لائبریریز میں رکھا جائے تاکہ عوام اس سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

الحاج محمد صدیق پولانی

بانٹوا کی حسین یادیں

یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے اپنے آبائی گاؤں یا شہر سے بڑی محبت وعقیدت اور اس کی اپنی حسین یادیں وابستہ ہوتی ہیں اور جب یہ یادیں کتابی صورت میں شائع ہوں تو آنے والی نسلوں کے لئے معلومات اور رہنمائی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

بانٹوا ریاست جوناگڑھ سے منسلک دربار تھا جہاں امن وآشتی اور خوشحالی تھی۔ یہ شہر میمن اور گجراتی مسلمان تاجروں کا مرکز تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بانٹوا کے میمنوں نے لاتعداد فلاح وبہبود کے کام کئے اور تعلیم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ حاجی موسیٰ لوائی بانٹوا میمن کمیونٹی کے نہایت قابل احترام سماجی رہنما تھے، موسیٰ لوائی میں دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور اس شعبے میں انہوں نے نام بھی کمایا۔

کتابیں تو بہت سی شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں قصے، کہانیاں اور افسانے ہوتے ہیں مگر سب سے زیادہ اہمیت اور افادیت تاریخی کتب کی ہے، موسیٰ لوائی کی کتاب ''عکسِ بانٹوا'' کا شمار اس نوعیت کی کتابوں میں ہوتا ہے جس میں نئی نسل کے لئے معلومات کا خزانہ ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بانٹوا کیا تھا اور اس کی حقیقت کیا تھی۔ یہ کتاب افسانہ یا سنی سنائی کہانی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس کے باوجود کہانی یا افسانے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ میں نے یہ کتاب بڑی دلچسپی سے پڑھی ہے کتاب کو پڑھتے ہوئے میں تصور میں اس زمانے میں چلا گیا تھا جب میری رہائش بھی بانٹوا میں تھی میری پیدائش بانٹوا میں 21 اپریل 1926ء کو ہوئی تھی اور وہیں میری شادی 5 راپریل 1943ء کو ہوئی اس اعتبار سے میں نے کافی وقت بانٹوا میں گزارا۔ اب میں بانٹوا کی حسین یادوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہوں۔

موسیٰ لوائی نے یہ کتاب گجراتی زبان میں تحریر کی تھی جسے ان کے صاحبزادے قاسم موسیٰ لوائی نے اردو میں ترجمہ کروا کر بہت خوبصورت انداز میں شائع کر کے نئی نسل پر احسان کیا ہے۔ میں اس کاوش پر قاسم موسیٰ لوائی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

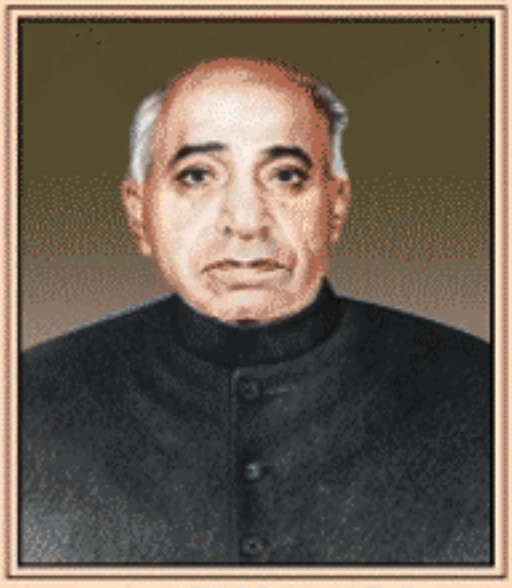

HAJI MOOSA LAWAI

کچھ حاجی موسیٰ لوائی کے بارے میں

حاجی موسیٰ ولی محمد لوائی کا نام میمن برادری کے سماجی اور فلاحی شعبے میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات کی وجہ سے آج بھی بانٹوا میمن برادری میں آپ کو صف اول کے اُن سماجی قائدین میں شمار کیا جاتا ہے جن کی ناقابل فراموش خدمات تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔

حاجی موسیٰ حاجی ولی محمد لوائی کی پیدائش بھارت کے صوبے کاٹھیاواڑ کی ریاست جوناگڑھ کے مشہور شہر بانٹوا میں یکم جنوری 1918ء کو ہوئی، آپ کے آباواجداد ایک زمانے سے بانٹوا شہر میں عمارتی لکڑی اور تعمیراتی سامان کا کاروبار کرتے تھے۔ گجراتی میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ اپنے آبائی کاروبار سے منسلک ہوگئے تھے۔ میمن ایجوکیشنل بورڈ کے اعزازی جنرل سیکریٹری بانٹوا ایجوکیشنل سوسائٹی کے بانی صدر، بانٹوا میمن جماعت کے نائب صدر اور جنرل سیکریٹری، بانٹوا میمن ملٹی پرپز سوسائٹی کے جنرل سیکریٹری، بانٹوا میمن انجمن حمایت اسلام کے جنرل سیکریٹری اور بانٹوا میمن خدمت کمیٹی کے نائب صدر کی حیثیت سے آپ کی سماجی خدمات گراں قدر ہیں، حاجی موسیٰ لوائی کی ایف۔ پی۔ سی۔ سی۔ آئی کی مینیجنگ کمیٹی کے رکن، مصطفےٰ بازار مرچنٹ ایسوسی ایشن کے صدر، کراچی چیمبر مرچنٹ ایسوسی ایشن کے نائب صدر اور کراچی نمبر امپورٹرز ایسوسی ایشن کے صدر کے طور پر تجارت وصنعت کے شعبے میں بھی بیش بہا خدمات ہیں۔ 20 اکتوبر 1997ء کو حاجی موسیٰ لوائی رحلت کر گئے۔

"عکس بانٹوا" حاجی موسیٰ لوائی نے گجراتی زبان میں تحریر کی تھی جو ان کے صاحبزادے قاسم لوائی کی کاوشوں سے اردو میں ترجمہ ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کتاب میں بانٹوا کی مختصر تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ حاجی موسیٰ لوائی کی یادیں بھی ہیں۔

الیاس شاکر
چیف ایڈیٹر
قومی اخبار گروپ آف نیوز پیپرز

Mr. Usman Batliwala, Mr. Pir M. Kaliya, Mr. Sidiq Polani, Mr. A. RazzakARY, Mr. Hanif S. Kaliya, Mr. Haroon Ahmed and Qasim Lawai at Book launching ceremony at Hotel Crown Plaza

Qasim Lawai is presenting the book "Akse Bantva" to Abdul Razzak ARY

Qasim Lawai is addressing the book launching of Akse Bantva